کیا آپ جاننا چاہتے ہیں کہ

- ازروئے قرآن حکیم ہمارا دین کیا ہے؟
- ہماری دینی ذمہ داریاں کون کون سی ہیں؟
- نیکی، تقویٰ اور جہاد کی اصل حقیقت کیا ہے؟

تو مرکزی انجمن خدام القرآن کے جاری کردہ

خط و کتابت کورس :

قرآن حکیم کی فکری و عملی رہنمائی

سے استفادہ کیجئے!

——— نیز ———

اللہ کے پر تاثیر کلام سے زیادہ سے زیادہ فیضیاب ہونے کی خاطر
عربی زبان سیکھنے کے لئے، اس کے ابتدائی قدم کے طور پر

عربی گرائمر خط و کتابت کورس

میں داخلہ لیجئے!

مزید برآں ترجمہ قرآن حکیم کورس میں بھی داخلے جاری ہیں

مزید تفصیلات اور پراسپکٹس کے حصول کے لئے رابطہ کیجئے :

شعبہ خط و کتابت کورسز

قرآن اکیڈمی، 36۔ کے، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون : 5869501

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ: ۲۶۹)

ماہنامہ حکمتِ قرآن

لاہور

بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے پی ایچ ڈی ڈی لٹ مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد ایم اے ایم فل پی ایچ ڈی

معاون: حافظ عاکف سعید ایم اے (فلسفہ)

ادارہ تحریر: حافظ خالد محمود خضر، پروفیسر حافظ نذیر احمد ہاشمی

جلد ۱۸ | ذوالحجہ ۱۴۱۹ھ — اپریل ۱۹۹۹ء | شمارہ ۴/۳

یکے از مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔ کے۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاہور ۱۴۔ فون: ۵۸۶۹۵۰۱

کراچی آفس: ۱۱ داؤد منزل متصل شاہ بحری، شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۶۵۸۶

سالانہ زرتعاون -/۸۰ روپے، فی شمارہ -/۸ روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس ہسپتال روڈ لاہور

اس شمارے کی قیمت ۱۵ روپے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حرفِ اوّل

زیر نظر شمارہ مضامین کے تنوع اور افادیت کے اعتبار سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ مرکزی انجمن خدام القرآن کے صدرِ مؤسس ڈاکٹر اسرار احمد کے سلسلہ وار مضمون "حقیقتِ ایمان" کے علاوہ دو مزید خطابات بھی ٹیپ کی ریل سے صفحہ قرطاس پر منتقل کر کے شاملِ اشاعت کئے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک خطاب جس کا تعلق مرکزی انجمن کے سالانہ اجلاس سے ہے' ایک سابقہ وعدے کے ایفاء کے طور پر شائع کیا گیا ہے' جبکہ دوسرا خطاب جو اس سال ماہ رمضان المبارک کی ۲۷ ویں شب کو' خلاصۂ مباحثِ قرآن کے شاندار پروگرام کی تکمیل پر محترم ڈاکٹر صاحب نے ارشاد فرمایا تھا' قارئین کے لئے خصوصی تحفہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس خطاب میں محترم صدرِ مؤسس نے "قرآن سے ہمارے حجاب کے اسباب" پر وضاحت سے روشنی ڈالی ہے کہ کیا سبب ہے کہ قرآن کو پڑھنے اور سننے سے آج ہمارے دلوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا! کیا وجہ ہے کہ آج ہم قرآن کو پڑھتے ہوئے یہ خیال کرتے ہیں کہ اس کے مخاطب ہم نہیں کوئی اور لوگ ہیں اور یہ کہ ہم جن مخصوص حالات میں زندگی گزار رہے ہیں ان پر شاید قرآنی آیات کا انطباق نہیں ہوتا؟ ـــــ وہ کون کون سے حجابات ہیں جو آج ہمارے اور قرآن کے درمیان حائل ہیں؟ یہ خطاب ہمارے لئے قرآن حکیم کے حوالے سے علمی ہی نہیں عملی پہلو سے بھی نہایت قیمتی رہنمائی کا حامل ہے۔

☆ ☆ ☆

قارئین نوٹ فرمالیں کہ زیر نظر شمارہ "حکمت قرآن" کی دو اشاعتوں (یعنی مارچ اور اپریل) کا قائم مقام ہے۔ بعض ناگزیر انتظامی مجبوریوں کے باعث ہم اس ناگوار قدم کو اُٹھانے پر مجبور ہوئے ہیں' تاہم تعدادِ صفحات میں اضافے کے ذریعے اس کی تلافی کرنے کی کسی قدر کوشش کی گئی ہے۔ امید ہے کہ کم از کم رواں سال کے دوران اس طرح کی صورتحال دوبارہ پیش نہیں آئے گی۔ السَّعی مِنَّا والاِتمام من اللّٰہ۔○○

قرآن حکیم سے ہمارے حجاب کے اسباب

رمضان المبارک کی ۲۷ویں شب' قرآن اکیڈمی لاہور میں
محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا خطاب

اَحمدہٗ واُصلّی علٰی رسولہِ الکریم ـــــ امابعد :
فاعوذباللّٰہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِیْٓ اَکِنَّۃٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَیْہِ وَفِیْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْۢ بَیْنِنَا وَبَیْنِکَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ○ ﴾ (حٰمٓ السجدۃ : ۵)

﴿ وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَیْنَکَ وَبَیْنَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا○ وَّجَعَلْنَا عَلٰی قُلُوْبِہِمْ اَکِنَّۃً اَنْ یَّفْقَھُوْہُ وَفِیْٓ اٰذَانِہِمْ وَقْرًا○ ﴾ (بنی اسرائیل : ۴۵۔۴۶)

تلاوتِ آیات اور ادعیہ ماثورہ کے بعد فرمایا :

آج میں خاص طور پر اس مسئلے پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں کہ کیا وجہ ہے کہ ہم پر قرآن مجید کی تاثیر نہیں؟ قرآن مجید کی آیاتِ بینات سن کر ہمارے دلوں پر اثر کیوں نہیں ہوتا؟ کیا ہمارے اور قرآن مجید کے مابین کوئی حجاب حائل ہے؟ سورۃ "فُصِّلَتْ" (حٰمٓ السجدۃ) میں کفارِ مکہ کا قول نقل ہوا ہے : ﴿ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِیْٓ اَکِنَّۃٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَیْہِ ﴾ "اور انہوں نے (اللہ کے رسول ﷺ سے) کہا : (اے محمد ﷺ) ہمارے دل پردوں اور غلافوں میں بند ہیں' اُن چیزوں کے اعتبار سے جن کی طرف آپ ہمیں بلا رہے ہیں"۔ ﴿ وَفِیْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ ﴾ "اور ہمارے کانوں میں بوجھ ہے" یعنی آپ کی بات ہمارے کانوں میں اُترتی نہیں۔ ﴿ وَمِنْۢ بَیْنِنَا وَبَیْنِکَ حِجَابٌ ﴾ "اور ہمارے اور تمہارے درمیان پردہ حائل ہے"۔ ﴿ فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ ﴾ "پس تم جو چاہو کرلو ہم اپنی سی کوشش کر رہے ہیں"۔ مطلب یہ ہے کہ تمہاری بات کامیاب نہیں ہوگی۔

خود اللہ تعالیٰ نے سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا : ﴿ وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ﴾ "(اے نبی!) جب آپ قرآن پڑھ کر سناتے ہیں تو ہم آپ کے اور ان لوگوں کے درمیان جو قیامت پر ایمان نہیں رکھتے ایک غیر مرئی پردہ حائل کر دیتے ہیں" ﴿ وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ﴾ "اور ان کے دلوں کے اُوپر پردے حائل کر دیتے ہیں کہ اسے سمجھ نہ پائیں اور ان کے کانوں کے اندر ثقل اور بوجھ پیدا کر دیتے ہیں"۔

ہمارے لئے لمحۂ فکریہ ہے کہ کہیں آج اُمّتِ مسلمہ ان آیات کی مصداق تو نہیں بن گئی ہے (معاذ اللہ) کیونکہ قرآن مجید کی اثر انگیزی کے بارے میں تو کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ متعدد واقعات ایسے ہیں کہ کئی لوگ وفد کی صورت میں حضور ﷺ کے پاس آئے' اس وفد کو جب قرآن سنایا گیا تو ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی ندیاں بہہ گئیں۔ قرآن مجید کی تاثیر کا یہ عالم سورۃ المائدہ میں یوں بیان ہوا ہے : ﴿ وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۭ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ ﴾ (آیت ۸۳) اسی طرح کا ایک وفد حبشہ سے آیا تھا' اس کا تذکرہ سورۃ القصص میں موجود ہے ﴿ وَاِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ ﴾ (آیت ۵۳) "اور جب ان پر (قرآن کی آیات) تلاوت کی گئیں تو وہ کہنے لگے کہ ہم ایمان لائے کہ یہ ہمارے رب کی طرف سے حق ہے"۔ جنّات کے بارے میں بھی قرآن مجید میں وارد ہوا ہے کہ وہ ایک مرتبہ قرآن سن کر ایمان لے آئے : ﴿ ..... اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۝ يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ﴾ (سورۃ الجن : ۱-۲) صرف یہی نہیں کہ ایمان لائے بلکہ قرآن کے داعی اور مبلغ بھی بن گئے اور اپنی قوم سے کہا ﴿ يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ .... ﴾ (الاحقاف : ۳۱) "اے ہماری قوم! اللہ کی طرف پکارنے والے کی پکار پر لبیک کہو اور اس پر ایمان لاؤ..."۔

قرآن کے پس منظر میں جانے کے اسباب

ایک طرف قرآن کی تاثیر کا یہ عالم ہے اور دوسری طرف ہم ہیں کہ قرآن سے کوئی اثر قبول نہیں کرتے۔ اس کا سبب کیا ہے؟ اس موضوع پر چھ صفحات پر مشتمل ایک مختصر مگر جامع مضمون میری کتاب "دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر" میں شامل

ہے۔ اس میں مَیں نے یہ بات بیان کی ہے کہ اسلام جب ایک تحریک کے دَور میں تھا' اُس وقت تحریک کو دعوت' جہاد اور قتال کے مراحل درپیش تھے' ابھی ریاست کی شکل نہیں بنی تھی' اس لئے اس مرحلے میں زیادہ زور ایمان اور قرآن پر تھا۔ لیکن جب اسلام نے ریاست کی شکل اختیار کرلی اور اسلامی حکومت قائم ہو گئی تو اب قانون اور اسلام کی اہمیت زیادہ ہو گئی۔ چنانچہ ایک Natural shift of emphasis ہوا ہے' کیونکہ دعوت اور تحریک کے دور میں ترجیحات کچھ اور رہوتی ہیں اور جب ایک اسلامی ریاست وجود میں آجاتی ہے تو تقاضے بدل جاتے ہیں۔ اس لئے کہ ریاست کا ایک حدود اربعہ ہوتا ہے' دفاع ہوتا ہے' قانون ہوتا ہے' یہ طے کرنا ہوتا ہے کہ کون مسلمان ہے کون نہیں ہے' کس کے کیا حقوق ہیں؟ شہریت کے کیا لوازم ہیں؟ ان مسائل پر توجہ کے باعث یہ بالکل قدرتی امر تھا کہ قرآن خود بخود ایک درجہ پس منظر میں چلا گیا۔ ہم نے پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم کا ایک مضمون بھی شائع کیا تھا جس میں انہوں نے قرآن مجید کے پس منظر میں جانے کے بہت سے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی بیان کیا ہے کہ ہمارے ہاں بادشاہوں' جاگیرداروں اور سرمایہ داروں نے شعوری طور پر کوشش کی ہے کہ قوم کی توجہ قرآن سے ہٹ جائے۔ اس لئے کہ قرآن تو ان کی مذمت کرتا ہے اور مُستضعفین کی حمایت کرتا ہے۔ مثلاً سورۃ الھمزۃ میں ارشاد ہوا : ﴿ اَلَّذِیْ جَمَعَ مَالاً وَّعَدَّدَہٗ ○ یَحْسَبُ اَنَّ مَالَہٗٓ اَخْلَدَہٗ ○ کَلاَّ لَیُنْبَذَنَّ فِی الْحُطَمَۃِ ○ ﴾ (آیات ۱ تا ۴) "جس نے مال جمع کیا اور اسے گن گن کر رکھا۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ اس کے پاس رہے گا۔ ہرگز نہیں وہ شخص تو چکنا چور کر دینے والی (جہنم) میں پھینک دیا جائے گا" ــــــ اس لئے انہوں نے چاہا کہ لوگ صرف قرآن کی تلاوت کرلیا کریں' سمجھا نہ کریں' سمجھیں گے تو ہماری تصویر سامنے آجائے گی' ہمارے خلاف ردِّ عمل پیدا ہو گا اور لوگ ہمارے خلاف کھڑے ہو جائیں گے۔ لہٰذا قرآن کو پس منظر میں جانے دو' بلکہ اس کو بالفعل پس منظر میں لے جانے کی کوشش کرو اور لوگوں کی توجہ کسی اور شے پر لگادو' انہیں تصوف کے راستے پر لگادو' کسی علمی جِدّ و جُہد میں لگادو' لیکن قرآن سے دُور رکھو۔ اس کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ یہ صحیح بخاری کی حدیث ہے' جس کے راوی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں' وہ فرماتے ہیں کہ

((حَفِظْتُ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وِعَائَيْنِ، اَمَّا اَحَدُهُمَا فَبَثَثْتُهُ فِيْكُمْ، وَاَمَّا الْآخَرُ لَوْ بَثَثْتُهُ لَقُطِعَ هٰذَا الْبُلْعُوْمُ))

"میں نے رسول اللہ ﷺ سے علم کے دو برتن بھر لئے تھے، ایک برتن میں سے تو میں نے تمہارے مابین خوب علم تقسیم کر دیا (عام کر دیا، تمہیں پڑھا دیا، سکھا دیا) لیکن اگر میں دوسرے برتن کے علم کو عام کروں تو میری یہ گردن اڑا دی جائے گی"۔

اسلام کا ایک علم عبادات کا علم ہے۔ یعنی وضو کا علم، طہارت کا علم، وضو کیسے کیا جاتا ہے، نواقضِ وضو کیا ہیں، غسل کی حاجت کب ہوتی ہے، غسل کی شرائط کیا ہیں، غسل کے لوازم کیا ہیں، فرائض کیا ہیں؟ پھر نمازوں کے قواعد و ضوابط کیا ہیں، کونسا پانی پاک اور کونسا ناپاک ہوتا ہے؟ یہ عبادات کا علم آج بھی خوب عام کیا جاتا ہے۔ مثلاً سعودی عرب کے ٹیلی ویژن سے اس علم کے مسائل پر بڑے بڑے پروگرام چلتے رہتے ہیں۔ جبکہ علم کی ایک دوسری قسم یہ ہے کہ اسلامی ریاست کیسی ہوتی ہے، اسلام کا نظامِ حکومت کیسا ہوتا ہے، اسلام میں سرمایہ داری کا کیا مقام ہے، جاگیرداری کا بھی کوئی مقام ہے یا نہیں؟ کیا بیت المال بادشاہوں کی ذاتی جاگیر ہوتا ہے؟ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا اشارہ اس علم کی طرف ہے کہ اگر میں یہ بیان کروں گا تو اسے برداشت نہیں کیا جائے گا اور میری یہ گردن کاٹ دی جائے گی۔ گویا کہ ایک برتن کا علم کہیں بند رہ گیا ہے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ ہماری حدیث کی کتابیں عبادات کے علم سے تو بھری پڑی ہیں، ان میں کتاب الطہارۃ، کتاب المیاہ، کتاب الصلاۃ، کتاب الصوم، کتاب الحج الغرض عبادات کے متعلق سارے معاملات موجود ہیں، لیکن دوسرے معاملات جس تفصیل سے ہونے چاہئیں اس تفصیل سے موجود نہیں۔ بعینہٖ اسی حوالے سے قرآن مجید کو بھی پیچھے دھکیلا گیا ہے۔

اب آیئے موجودہ حالات کی طرف کہ آج قرآن مجید کے پس منظر میں جانے کی صورت کیا ہے۔ ایک تو وہ لوگ ہیں جو قرآن کو سمجھتے نہیں، صرف ثواب حاصل کرنے کے لئے پڑھتے ہیں۔ عجمی لوگ اکثر و بیشتر تو وہی ہیں جو قرآن کو سمجھتے ہی نہیں اور اس کے لئے ان کے پاس سب سے بڑی دلیل "ثواب" کی ہے، اس لئے کہ ان کے ہاں وہ حدیثیں عام کر دی گئیں کہ ایک حرف پڑھو گے تو دس نیکیاں لکھی جائیں گی۔ چنانچہ انہیں سمجھنے

سے سرو کار نہیں ہے' کیونکہ ان کے نزدیک صرف پڑھنا اور تلاوت کرنا ہی اصل ہے۔ یہ حدیث صحیح ہے جس میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ "الم" کو ایک حرف نہ سمجھنا' "الف" ایک حرف ہے' "لام" ایک حرف ہے اور "میم" ایک حرف ہے۔ گویا تم نے ایک حرف پڑھا تو تیس نیکیاں تمہارے حساب میں درج ہو گئیں۔ حدیثِ نبویؐ سر آنکھوں پر' میں اس حدیث کی نفی نہیں کرتا' لیکن اس طرف بھی توجہ کی ضرورت ہے کہ آیاتِ قرآنی کو نہ سمجھنے سے کوئی debit (نقصان یا گناہ) بھی ہوتا ہے یا نہیں؟ کریڈٹ (credit) تو ہم گنتے جا رہے ہیں کہ ہم نے اتنا ثواب حاصل کر لیا' ختم قرآن کر لیا۔ لوگ گنتی کرتے ہیں کہ ہم نے رمضان میں اور اعتکاف کے دوران اتنے قرآن ختم کر لئے۔ آپ ڈھیروں کریڈٹ تو جمع کر رہے ہیں' لیکن قرآن کو نہ سمجھنے کا کوئی debit بھی ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ اس طرزِ عمل کی وجہ سے ساتھ ساتھ آپ کا کریڈٹ ختم ہو رہا ہو اور debit بڑھ رہا ہو۔ میں نے ۶۸ء میں جب "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" کے عنوان سے کتاب لکھی تھی جو کہ مسجد خضراء سمن آباد میں کی گئی تقریروں پر مبنی ہے' تو کچھ عرصے بعد ۱۹۷۰ء کا پورا رمضان المبارک میں نے مدینہ منورہ میں گزارا۔ آخری عشرے میں مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ وہاں مسجد نبوی میں اعتکاف کے لئے آ گئے۔ میں نے اپنا یہ کتابچہ ان کو دیا کہ مولانا صاحب! میں اس کو بڑے پیمانے پر عام کرنا چاہتا ہوں' آپ اس کو دیکھ لیجئے' کہیں اگر کوئی غلطی ہوئی ہے تو نشاندہی کر دیں تاکہ اس کی اصلاح ہو جائے۔ انہوں نے حالت اعتکاف میں وہ کتابچہ پڑھا اور ایک جگہ اصلاح کی۔ اس کتابچے میں میں نے قرآن مجید کے تیسرے حق "تذکر و تدبّر" کے ضمن میں لکھا تھا کہ جو لوگ اَن پڑھ رہ گئے ہوں اور اب عمر کے اس حصے میں ہوں کہ سیکھ بھی نہ سکتے ہوں وہ تو اگر صرف وضو کر کے بیٹھ جائیں اور قرآن کھول کر اس کی سطروں پر انگلی پھیرتے رہیں اور اپنی اس محرومی پر روتے رہیں کہ ہم نے قرآن نہیں سیکھا تو انہیں اس عمل کا بھی ثواب ملے گا ـــــ لیکن جنہوں نے بی اے اور ایم اے کیا ہو' پی ایچ ڈی کی ڈگری لی ہو اور کئی زبانیں سیکھی ہوں وہ اگر عربی نہ پڑھیں اور قرآن کو سمجھ کر نہ پڑھیں تو انہیں محض تلاوت کا کوئی ثواب نہیں ملے گا۔ اس مقام پر انہوں نے یہ اصلاح تجویز کی کہ یوں نہیں بلکہ یوں کہیں کہ ہو سکتا ہے کہ ان کے اعراض عن القرآن یعنی قرآن کو سمجھنے کی کوشش نہ کرنے کی سزا

تلاوتِ قرآن کے ثواب سے بڑھ جائے[1] مولانا مرحوم کا مشورہ بہت عمدہ تھا۔ اس سے مضمون اور نکھر گیا۔ کیونکہ یہ اعراض ہی تو ہے کہ آپ نے ایم اے کیا' .Ph.D کی' فزکس اور کیمسٹری میں سپشلائزیشن کیا' اتنے عرصے تک پڑھتے رہے لیکن اتنی عربی نہ سیکھ سکے کہ قرآن کو براہِ راست سمجھ سکیں۔ ایسے لوگوں کے پاس روزِ محشر کیا دلیل ہو گی' کیا عذر ہو گا؟ جیسے اقبال نے کہا ہے ؎

یہ گھڑی محشر کی ہے تُو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل اگر کوئی عمل دفتر میں ہے!

آپ تصور کریں کہ حشر کی گھڑی قائم ہو چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ سے پوچھ رہا ہے کہ تم نے عربی کیوں نہیں سیکھی' قرآن کیوں نہیں سمجھا تو آپ کے پاس کیا جواب ہو گا؟۔ ظاہر ہے کوئی جواب نہیں ہو گا اور اس اعراض عن القرآن کی سزا کے طور پر سارا ثواب صاف ہو جائے گا اور گرفت بڑھتی چلی جائے گی۔

عجمی لوگوں کا معاملہ تو سمجھ میں آتا ہے کہ عربی نہ سیکھی لہٰذا قرآن سمجھ میں نہ آیا' لیکن آج عربوں کو کیا ہوا؟ قرآن تو ان کی زبان میں نازل ہوا ہے' ان پر قرآن کی تاثیر کیوں ظاہر نہیں ہو رہی؟ یہ وہ سوال ہے جس کے جواب سے مسئلہ آپ کے سامنے پوری طرح نکھر کر سامنے آجائے گا۔ کیونکہ اگر قرآن اور ہمارے درمیان صرف عربی زبان کا

---

[1] "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" کی اصل عبارت درج ذیل ہے :

".... بغیر فہم و فراست کے مجرد تلاوت کا جواز ایسے لوگوں کیلئے تو ہے جو پڑھنے لکھنے سے بالکل محروم رہ گئے ہوں اور اب تعلیم کی عمر سے بھی گزر چکے ہوں۔ ایسے لوگ اگر ٹوٹے پھوٹے طریق پر تلاوت کر لیں تو بھی بہت غنیمت ہے اور اس کا ثواب انہیں ضرور ملے گا۔ بلکہ ایک ایسا اَن پڑھ شخص جو ناظرہ بھی نہ پڑھ سکتا ہو اور اب اس کیلئے اس کا سیکھنا بھی ممکن نہ ہو وہ اگر اس یقین کے ساتھ کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اسے کھول کر بیٹھتا ہے اور محبت و عقیدت اور احترام و تعظیم کے ساتھ اس کی سطور پر محض انگلی پھیرتا رہتا ہے تو اس کے لئے یہ عمل بھی یقیناً موجب ثواب و برکت ہو گا' لیکن پڑھے لکھے لوگ' جنہوں نے تعلیم پر زندگیوں کا اچھا بھلا عرصہ صرف کر دیا ہو اور دنیا کے بہت سے علوم و فنون حاصل کئے ہوں' مادری ہی نہیں غیر ملکی زبانیں بھی سیکھی ہوں' اگر قرآن مجید کو بغیر سمجھے پڑھیں تو عین ممکن ہے کہ وہ قرآن کی تحقیر و توہین اور تمسخر و استہزاء کے مجرم گردانے جائیں۔ اور اس اعراض عن القرآن کی سزا تلاوت کے ثواب سے بڑھ جائے...."

حجاب ہے تو قرآن کی تاثیر آج عربوں پر کیوں نہیں ہے؟ ان پر اس کی تاثیر ہوتی تو آج وہاں اسلام کا نظامِ عدل وقسط قائم ہوتا' اسلام کا بول بالا ہوتا' لیکن ایسا نہیں ہے۔ آج مغربی تہذیب میں جتنے عرب غرق ہیں اتنے ہم بھی نہیں۔ شمالی افریقہ کے پورے ساحل پر دینی اور اخلاقی اعتبار سے بدترین قومیں آباد ہیں' جن کی زبان عربی ہے۔ الجزائر' تیونس اور لیبیا کے رہنے والوں کی زبان عربی ہے' لیکن ان پر قرآن کا کوئی اثر کیوں نہیں ہے۔ جس پر غور وخوض کی ضرورت ہے۔

مکّی قرآن سے ہمارے حجابات

پیش نظر مسئلے کا میں نے تجزیہ کیا تو پہلی بات یہ سامنے آئی کہ ہم قرآن کے ایک بڑے حصے کو اپنے حالات کے اعتبار سے غیر متعلق (Irrelevant) سمجھتے ہیں۔

پہلا حجاب :

ہم مکی قرآن پڑھتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ساری باتیں کفر اور کفار کی ہو رہی ہیں' جبکہ ہم مسلمان ہیں' بزعمِ خود پکے مؤمن ہیں' ہمارا اس سے کیا تعلق؟ کفر و شرک کی ساری بحثیں ہم غیر متعلق سمجھتے ہیں کہ یہ تو دیوی' دیوتاؤں کے شرک کی باتیں ہو رہی ہیں۔ لات وعزیٰ سے بھلا ہمارا کیا سروکار؟ ہم تو ان کے پوجنے والے نہیں۔ اس لئے یہ ساری بحثیں ہم سے غیر متعلق قرار پاتی ہیں۔ اسی طرح قصص النبیین ہمارے لئے پرانے قصوں کی حیثیت رکھتے ہیں' ان کے بارے میں ہمارا طرزِ عمل یہ ہے کہ وہ بہت اچھے لوگ تھے' وہ نبی تھے' ہم غیر نبی ہیں۔ اس لئے انبیاء علیہم السلام کا تذکرہ ہمارے لئے غیر متعلق ہے۔ انباء الرسل اس لئے غیر متعلقہ ہیں کہ اب کوئی رسول نہیں آئے گا۔ اس لئے کسی قوم پر عذابِ ہلاکت بھی نہیں آ سکتا' کیونکہ ﴿ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا ﴾ "ہم عذاب نازل نہیں کرنے والے ہیں جب تک رسول نہ بھیجیں"۔ نہ اب رسول آئے گا' نہ عذاب آئے گا۔ چنانچہ یہ قصے بھی ہمارے نزدیک محض تاریخی حیثیت کے حامل ہیں' ان کا عملی طور پر کوئی تعلق ہم سے نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ کہیں اخلاق کی بات آ گئی' سچ بولنے کی تاکید آ گئی' جھوٹ کی مذمت آ گئی تو ہم نے سمجھا کہ اس کا کوئی تعلق ہم سے ہے۔ ورنہ ہم سمجھتے ہیں کہ پورے مکی قرآن کا ہمارے ساتھ سرے سے کوئی تعلق نہیں۔

حالانکہ یہ بات قطعاً غلط ہے۔

دوسرا حجاب :

ایمانیات کی بحث کو بھی ہم اپنے متعلق نہیں سمجھتے' حالانکہ ہمارے پاس حقیقی ایمان نہیں ہے' جو کچھ ہے وہ ایک موروثی عقیدہ (Racial Creed) ہے اور اس کے ساتھ یقین کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ صرف قانونی ایمان ہے' جو آج اکثریت کو حاصل ہے۔ لیکن قانونی ایمان کی آخرت میں کوئی حیثیت نہیں' وہاں حقیقی ایمان کے اعتبار سے پرکھا جائے گا۔ اس لئے مکّی قرآن میں ایمان کی بحثیں سمجھنا بھی ضروری ہیں' جن میں ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ کے دلائل دیئے گئے ہیں۔ لیکن ہمارا یہ زعم کہ ہم تو صاحب ایمان ہیں' ہمارے اور قرآن کی ان طویل بحثوں کے درمیان حجاب بن گیا ہے۔

تیسرا حجاب :

نزولِ قرآن کے وقت شرک کی جو صورتیں موجود تھیں' آج ان کے علاوہ بھی شرک کی بہت سی شکلیں ہیں جن میں ہم مبتلا ہیں' مثلاً سیاسی شرک۔ نفس پرستی کا شرک تو خود قرآن میں بیان ہوا ہے : ﴿ اَفَرَاَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ﴾ "(اے نبی!) کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہشاتِ نفس کو اپنا معبود بنالیا ہے؟" لیکن ہم خود کو شرک سے بالکلیہ بری سمجھتے ہیں۔ حالانکہ مسلمانوں کا سوادِ اعظم آج بھی اُسی دیوی دیوتاؤں اور بُت پرستی والے شرک قدیم میں مبتلا ہے۔ غور کیجئے یہ مزاروں پر کیا ہو رہا ہے؟ اس میں اور بت پرستی میں کیا فرق ہے؟ صرف ایک چیز کی کسر ہے کہ مورتی نہیں بنی ہوئی۔ اگر قومِ نوح نے اپنے اولیاء اللہ "ود' سواع' یغوث' یعوق' نسر" کے مجسمے تراش لئے تھے تو کیا یہ سب کچھ ہم اپنے اولیاء اللہ کے ساتھ نہیں کر رہے؟ ان سے "شَیْئًا لِلّٰہِ" کہہ کر مانگتے نہیں ہیں؟ ان سے یہ نہیں کہتے کہ "اَغِثْنِیْ" میری فریاد سنئے اور میری مدد کیجئے۔ کیا ہم نہیں سمجھتے کہ وہ ہمیں اللہ سے چھڑا لینے والے ہیں ﴿ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ﴾ کیا ہمارے عوام کی عظیم اکثریت اس توہماتی شرک میں مبتلا نہیں ہے؟ کیا ہمارے ایلیٹ کلاس کے لوگ' ٹاپ کلاس کے قائد داتا دربار پر حاضری نہیں دیتے؟ اس سے کس شرک کی تائید ہوتی ہے؟ کوئی مہم (campaign) شروع کرنی ہو تو

داتا دربار پر حاضری دیتے ہیں۔ کوئی فائل کھل گئی ہے تو داتا دربار پر چادر چڑھا رہے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں اُس زمانے کا جو شرک بیان ہوا ہے وہ شرک آج بھی ہمارے ہاں جوں کا توں موجود ہے۔

ایک اور بات بہت ڈرتے ڈرتے کہہ رہا ہوں کہ اللہ کے رسولوں کے ساتھ جو گستاخیاں ہوئیں کہ کسی کو خدا کا بیٹا بنا دیا گیا' کسی کو کچھ اور بنا دیا گیا' کیا ہم محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ وہی کچھ نہیں کر رہے؟ "سرورِ دو عالم" اور "شہنشاہِ دو عالم" کے کیا معنی ہیں؟ یہ شان تو صرف اللہ کی ہے۔ قرآن تو کہتا ہے ﴿ وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهٖ اَحَدًا ﴾ اور ﴿ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ ﴾ یعنی اللہ کی بادشاہی میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں میں تو بندہ ہوں' غلام ہوں' غلاموں کی طرح اکڑوں بیٹھ کر کھانا کھاتا ہوں۔ آپؐ فرماتے ہیں کہ عبدیت میرے سر کا تاج ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں جہاں بھی آنحضور ﷺ سے خصوصی التفات کا اظہار فرماتا ہے وہاں آپؐ کی عبدیت کو نمایاں کرتا ہے مثلاً : ﴿ سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ ﴾ (بنی اسرائیل : ۱) ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ ﴾ (الکہف : ۱) ﴿ تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ ﴾ (الفرقان : ۱) اور ہم نے حضور ﷺ کو کیا بنا دیا ہے؟ یہ غور کرنے کی باتیں ہیں۔ حضور ﷺ کا اپنا عالم تو یہ تھا کہ آپؐ دعا مانگا کرتے تھے : ((اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ عَبْدُكَ وَابْنُ عَبْدِكَ وَابْنُ اَمَتِكَ)) "اے اللہ میں تیرا بندہ ہوں' میرا باپ بھی تیرا ادنیٰ غلام تھا اور میری ماں بھی تیری ادنیٰ کنیز' ادنیٰ لونڈی تھی"۔ ((فِيْ قَبْضَتِكَ)) "میرا پورا وجود تیرے قبضہ قدرت میں ہے"۔ ((نَاصِيَتِيْ بِيَدِكَ)) "میری پیشانی تیرے ہاتھ میں ہے" ((مَاضٍ فِيَّ حُكْمُكَ)) "میرے وجود میں تیرا حکم جاری و ساری ہے" ((عَدْلٌ فِيَّ قَضَاءُكَ)) "میرے بارے میں جو فیصلہ تو کرے گا وہ عدل ہو گا"۔ حضور ﷺ کے ہاں عبدیت و عجز کا یہ عالم ہے۔ قرآن میں آتا ہے ﴿ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ﴾ "بادشاہی اللہ کے سوا کسی کی نہیں"۔ داؤد علیہ السلام بھی خلیفہ تھے۔ جب ریاستی شکل بن گئی تو محمدؐ رسول اللہ ﷺ بھی خلیفہ تھے۔ یعنی آپؐ اللہ کے خلیفہ تھے' اللہ کے بندے تھے' اللہ کے رسول تھے۔ کلمۂ شہادت میں بھی آپؐ کی عبدیت کا اقرار ہے "اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ"۔ یہ تو ایک لفظ ہے "سرورِ دو عالم" جس کی طرف شاید کسی کا خیال بھی نہ گیا ہو' لیکن واقعہ یہ

ہے کہ ہم نے کسی گمراہی کو چھوڑا نہیں۔

اسی طرح کفار کا ذکر ہو تو ہم سمجھتے ہیں کہ یہ تو پچھلوں کی باتیں ہیں۔ یہ ابو جہل کا مسئلہ ہے' یہ ابولہب کا تذکرہ ہے' اس کا ہم سے کیا سروکار۔ حالانکہ ہمیں ان کے کفر اور طرزِ عمل سے بچانے کے لئے ان کا ذکر قرآن میں آیا ہے۔

مدنی قرآن سے ہمارے حجابات

پہلا حجاب :

اب مدنی قرآن کی طرف آیئے' اس میں نفاق کے بارے میں کتنی مفصّل بحثیں ہیں۔ لیکن کیا کبھی آپ نے سوچا کہ مجھ سے اس بحث کا کیا تعلق ہے' جبکہ ان بحثوں پر پوری پوری سورتیں (منافقون' توبہ اور نساء) موجود ہیں۔ سورۂ توبہ اور سورۂ نساء میں تو نفاق کی طویل ترین بحثیں آئی ہیں۔ لیکن ہم تو بزعمِ خود مؤمن ہیں' اس لئے یہ ہم سے متعلق نہیں ہیں۔ جبکہ نفاق وہ روگ اور وہ بیماری ہے جس سے اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھنا چاہیئے۔ حضور ﷺ کی حدیث ہے ((مَا خَافَهُ اِلَّا مُؤْمِنٌ وَّمَا اَمِنَهُ اِلَّا مُنَافِقٌ)) یعنی نفاق کا صرف مؤمن اندیشہ رکھتا ہے کہ کہیں میں منافق تو نہیں ہو گیا اور صرف منافق ہی اس سے اپنے آپ کو محفوظ و مامون سمجھتا ہے کہ نفاق کا مجھ سے کیا سروکار؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ' جن کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر ہوتا' جس راستے سے عمر چلتا ہے شیطان اس راستے سے کنّی کترا جاتا ہے۔ مزید فرمایا کہ ہر نبی کی اُمّت میں محدّثین ہوتے ہیں جن سے اللہ کلام کرتا ہے اور میری امت کا محدث عمر ہے' اُن کا یہ حال ہے کہ ایک بار حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ' جنہیں حضور ﷺ نے منافقین کے نام بتا دیئے تھے' سے کہتے ہیں کہ "اے حذیفہؓ! میں تمہیں اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کہیں میرا نام تو منافقوں کی فہرست میں نہیں ہے"۔ ظاہر بات ہے نفاق کی بحثیں تو وہ شخص پڑھے گا کہ جو اس سے بچنا چاہے گا اور جانے گا کہ یہ مجھ سے متعلق ہیں' اس لئے میں اس کا ایک ایک لفظ پڑھوں' اپنے اندر جھانکوں' اپنا جائزہ لوں۔ مجھے یہ شعر بہت عمدہ لگتا ہے ؎

جانِ جملہ علم ہا این ست و ایں
تا بہ دانی من کیم در یومِ دیں

یعنی پورے علم کا خلاصہ اور جان یہ معلوم ہو جانا ہے کہ قیامت کے دن میں کہاں کھڑا ہوں گا' مومنین صادقین کی صف میں یا منافقین کی صف میں۔ پل صراط پر اوندھا پڑا ہوں گا یا کہ سلامتی سے نکل جاؤں گا۔

دوسرا حجاب :

اسی طرح جہاد اور قتال کو فرضِ کفایہ سمجھتے ہوئے ہم ان بحثوں سے لاتعلق ہو جاتے ہیں کہ یہ فرضِ عین تو نہیں ہے۔ بس بات ختم ہوئی۔ چنانچہ قتال کے واقعات تو ہمارے نزدیک غزوۂ بدر' غزوۂ اُحد اور غزوۂ احزاب کی تاریخ کی حیثیت رکھتے ہیں' جن سے ہمارا کوئی عملی تعلق نہیں۔ نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ فرض ہے' جہاد تو ہم پر فرض نہیں ہے۔ اس لئے یہ ساری بحثیں ہم سے غیر متعلق ہو گئیں۔ بس پڑھو اور ثواب لے لو۔

تیسرا حجاب :

چونکہ اسلامی ریاست قائم نہیں ہے لہٰذا شریعت کے اجتماعی احکام بھی ہم سے غیر متعلق ہو گئے' کیونکہ انفرادی حیثیت سے ان پر عمل کا کوئی سوال ہی نہیں۔ میں چور کا ہاتھ نہیں کاٹ سکتا' میں زانی کو سنگسار نہیں کر سکتا۔ لہٰذا یہ حصہ بھی ہم سے غیر متعلق ٹھہرا اور ہماری چھٹی ہو گئی کہ ہم سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں۔ یہ ساری چیزیں ہمارے اور قرآن کے مابین حجاب بن گئی ہیں۔ مدنی قرآن میں سے صرف عبادات' نماز' طہارت' وضو' تیمّم اور روزے کا ہم سے تعلق ہے۔ چنانچہ پورے مکی قرآن میں سے صرف اخلاقی تعلیمات اور پورے مدنی قرآن میں سے عبادات' یہ دو چیزیں ہیں جن کو ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ہمارے متعلق ہیں' باقی مباحث کے بارے میں اگرچہ ہم زبان سے نہیں کہتے کہ یہ اساطیر الاولین ہیں' لیکن ہمارا طرزِ عمل ظاہر کرتا ہے کہ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ پچھلوں کی کہانیاں اور قصے ہیں' سابقہ اقوام کی تاریخ ہے' نوح علیہ السلام سے لے کر موسیٰ علیہ السلام تک کے حالات ہیں جو کہ بار بار بیان ہو رہے ہیں' ان کا ہم سے کیا تعلق؟ جب یہ حجابات ہمارے اور قرآن کے مابین ہوں گے تو قرآن کی تاثیر کیسے ہو گی؟ جو سمجھتے ہی نہیں ان کو چھوڑیئے' اہلِ عجم کا معاملہ الگ ہے' میں تو عربوں کی بات کر رہا ہوں کہ ان حجابات میں وہ بھی مبتلا ہیں۔

چوتھا حجاب :

یہ وہ حجاب ہے جو اہلِ علم لوگوں کی کوتاہی کے باعث پیدا ہوا ہے۔ اقبال نے اسے "عذابِ دانشِ حاضر" قرار دیا ہے ؎

عذابِ دانشِ حاضر سے باخبر ہوں مَیں
کہ میں اِس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیل

اقبال کہہ رہے ہیں کہ انہوں نے ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۰ء تک جدید فلسفہ پڑھا ہے' جدید تہذیب اور جدید افکار و نظریات کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ یہ عذابِ دانش حاضر ہے۔ اس عذاب دانش حاضر کا اثر پورے عالم اسلام میں اتنا گہرا ہے کہ عالم اسلام کے بڑے بڑے ذہین لوگ (The intelligentsia of the Muslim World) اس عذاب میں مبتلا ہیں اور کہیں اس کا توڑ نہیں کیا جا رہا۔ فتویٰ دے دینا' کہ فلاں شے حرام ہے' اور بات ہے' لیکن فکری سطح پر اس کا توڑ کرنا اور دلیل سے اس کو رد کرنا بہت ضروری ہے۔ یہ کام امت کے اہل علم کا ہے جو کبھی ابن تیمیہ اور غزالی رحمہما اللہ نے کیا تھا۔ اُس وقت یونان کا فلسفہ و فکر اور تصوف اسلام کے لئے چیلنج بن کر آیا تھا اور ان ساری چیزوں کا حملہ اُس وقت بھی عالم اسلام پر ہوا تھا۔ لیکن یہ دو عظیم شخصیات اٹھیں اور انہوں نے اس کا جادو تار تار کر کے رکھ دیا کہ اس میں کچھ نہیں رکھا' یہ محض سراب ہے۔ ابن تیمیہؒ نے "الرَّد علی المنطقیین" کے ذریعے "لوہا لوہے کو کاٹتا ہے" کے مصداق ان کی Logic رد کر کے دکھادی کہ یہ منطق خود اپنے اصولوں سے ختم ہوتی ہے۔ امام غزالیؒ نے "تھافۃ الفلاسفۃ" کے ذریعے واضح کر دیا کہ یہ سب فلسفے بے بنیاد ہیں۔ موجودہ دور میں سوائے علامہ اقبال کی شخصیت کے کسی نے اس فکری حملے کا مقابلے کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اعلیٰ علمی و فکری سطح پر یہ اُمّتِ مسلمہ کی بہت بڑی کوتاہی ہے۔ حالانکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ دانش حاضر پر کاری ضرب لگائی جائے۔

اس سے بھی آگے بڑھ کر وہ چیزیں جو قرآن کی حقانیت کا ثبوت ہیں' ان کو بھی ہم نے ایک طرف رکھ دیا کہ ان سے ہمارا کوئی سروکار ہی نہیں۔ یہ سائنسی انکشافات دراصل قرآن کی حقانیت کا ثبوت ہیں۔ سورۃ حٰمٓ السَّجدۃ میں فرمایا گیا ﴿ سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ﴾ "ہم ان کو اس کائنات میں اور

خود ان کے اپنے وجود میں نشانیاں دکھاتے چلے جائیں گے (اور ہماری نشانیاں ان پر منکشف ہوتی جائیں گی) یہاں تک کہ ان پر واضح ہو جائے گا کہ یہ قرآن حق ہے"۔ ایک سے ایک بڑھ کر سائنس کے انکشافات ہوں گے' جو ثابت کریں گے کہ یہ قرآن حق ہے۔ قرآن نے یہ بات چودہ سو برس پہلے کہی ہے' لیکن ہمارے علماء نے سائنس کا دروازہ اپنے لئے بند کر رکھا ہے اور خود کو "قَالَ اللّٰہُ وَقَالَ الرَّسُوْلُ" تک محدود کر لیا ہے۔ بلکہ قرآن بھی نہیں' ان کے نزدیک اصل چیز فقہ ہے' کیونکہ اس سے فتوے دینے ہوتے ہیں۔ حدیث میں بھی زیادہ ذوق و شوق اہلحدیث کا ہے ورنہ حنفی کیلئے تو فقہ کافی ہے اور اہلحدیث کیلئے حدیث بہت کافی ہے۔ قرآن کہیں بھی نہیں' نہ اِن کے ہاں نہ اُن کے ہاں۔ سائنس کے حوالے سے ان کے ہاں اس قدر جمود طاری ہے کہ ابھی تک زمین کے ساکن ہونے اور سورج کے زمین کے گرد گھومنے کے نظریات پر قائم ہیں۔ حالانکہ اس ضمن میں صحیح رخ یہ ہے' جس میں اللہ نے مجھے انشراح عطا فرمایا ہے' کہ جہاں تک دین کا عملی پہلو ہے اس میں پیچھے اسلاف کی طرف جائیں۔ پیچھے ائمہ مجتہدین تک' مزید پیچھے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تک اور مزید پیچھے اپنے آپ کو رسول اللہ ؐ کے قدموں میں ڈال دیں۔ دین کے عملی پہلو میں آپ کو آگے نہیں جانا' زمانے کے ساتھ نہیں جانا۔ کیونکہ عملی اعتبار سے دین محمد ؐ رسول اللہ ؐ پر کامل ہو گیا۔ عمل میں آنحضور ﷺ سے جو ثابت ہو وہ سر آنکھوں پر ؏

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

حلال' حرام' واجب' فرض' شریعت کے احکامِ دین کا عملی پہلو ہے' ان کے لئے پیچھے جاؤ ؏ "دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تُو!" البتہ حکمت' سائنس' تجرباتی علوم میں آگے سے آگے جانا چاہیئے۔ قربان جایئے اللہ کے رسول ﷺ پر کہ "تابیرِ نخل" کے معاملے میں کس قدر سادگی سے ایسا اصول بتا دیا۔ حضور ﷺ چونکہ مکّے میں رہتے تھے' وہاں زراعت تھی ہی نہیں' لہٰذا زراعت سے آپ کو کوئی دلچسپی تھی نہ اس کے اصولوں سے کوئی واقفیت تھی۔ مدینے کے لوگ زراعت پیشہ تھے' انہیں اپنے تجربے سے معلوم تھا کہ کھجور کے نر اور مادہ پھول علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں' انہیں قریب لے آیا جائے تو پھر Fertilization زیادہ ہوتی ہے' لہٰذا پھل زیادہ ہوتا ہے۔ حضور ﷺ نے آ کر دیکھا تو فرمایا یہ تم لوگ کیا کرتے ہو' فطرت اپنی نگہداشت خود کر سکتی ہے' تم قدرت کے معاملات

میں مداخلت نہ کرو تو کیا ہے۔ آپؐ نے رد کا بھی نہیں بلکہ کہا کہ "تم یہ نہ کرو تو کیا ہے"۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے لئے آپ کا یہ کہنا بھی حکم کے درجے میں تھا۔ چنانچہ انہوں نے یہ عمل نہیں کیا' لیکن اس سال فصل کم ہو گئی۔ وہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ حضور آپ نے فرمایا تھا نہ کریں تو کیا ہے' ہم نے تابیر نخل نہ کی' لیکن اس سے فصل کم ہو گئی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا دیکھو میں تمہیں یہ چیزیں سکھانے نہیں آیا ((اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْیَاکُمْ)) دنیاوی معاملات تم مجھ سے بہتر جانتے ہو' اس لئے یہ عمل کرتے رہو۔ یہ کتنا بڑا اصول ہے۔ اسی طرح ہمارے سائنسی علوم تجرباتی علوم ہیں۔ قرآن سائنس پڑھانے نہیں آیا۔ یہ تو انسان کے لئے راہ ہدایت لے کر آیا ہے۔ لیکن اس میں کچھ ایسے حقائق بھی بیان ہوئے ہیں کہ سائنس کے میدان میں جب کسی حقیقت کی طرف انسان کی رسائی ہوتی ہے اور وہ بات قرآن میں بھی آئی ہو تو اس سے قرآن کی حقانیت مبرہن ہو جاتی ہے۔ قرآن ایمبریالوجی' زوآلوجی' باٹنی' اسٹرونومی پڑھانے نہیں آیا۔ صرف آیاتِ الٰہیہ کے اندر ان کے حوالہ جات ہیں اور وہ اگر سائنس کے حوالے سے ثابت ہو جاتے ہیں تو معلوم ہوا کہ وہ قرآن مجید کی حقانیت کا ایک ثبوت ہیں' جیسا کہ خود قرآن نے دعویٰ کیا ہے : ﴿ سَنُرِیْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ﴾ ہم انہیں اپنی آیات دکھائیں گے آفاق میں بھی اور انفس میں بھی۔ بڑی سے بڑی آیتیں ظاہر ہوتی جائیں گی' نئی سے نئی نشانیاں سامنے آئیں گی' جس سے یہ بات مبرہن سے مبرہن ہوتی چلی جائے گی کہ یہ قرآن مجید حق ہے۔ اسی deficiency کے باعث ایک پڑھا لکھا آدمی جب قرآن پڑھتا یا سنتا ہے' اور قرآن مجید کی جو تشریح عام علماء بیان کرتے ہیں اس کے درمیان اتنا Gap محسوس کرتا ہے کہ قرآن اس پر اثر ہی نہیں کرتا۔

راہِ عمل

یہ اسباب ہیں جن کی وجہ سے ہم اس وقت قرآن مجید کی تاثیر سے محجوب ہو کر رہ گئے ہیں ـــــ اور اب جبکہ بیماری کا پتہ چل گیا ہے تو ان حجابات سے نکلنے کے لئے ہمیں عمل کی شاہراہ پر آنا ہو گا۔ اس کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے ایمان کی حقیقت کو سمجھیں کہ ہم جس ایمان کے حامل ہیں اس کی حیثیت صرف موروثی عقیدے کی ہے اور یہ ایمان صرف ایمان باللسان ہے' جیسے سورۃ الحجرات میں ہے : ﴿ قَالَتِ

الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا ﴾ جبکہ ایمانِ مطلوب تو تصدیق بالقلب والا ایمان ہے۔ یہ ایمان کہاں سے ملے گا؟ یہ صرف اور صرف قرآن سے ملے گا۔ لہٰذا قرآن مجید کے ان حصوں کو پڑھنا ہو گا' ان پر غور کرنا ہو گا' انہیں اچھی طرح گہرائی میں سمجھنا ہو گا۔ ان مقامات پر اپنے ہائی پاور لینز زفوکس کرنے ہوں گے جہاں ایمان سے متعلق مباحث آئے ہیں۔

اسی طرح ہم شرک سے بچے ہوئے نہیں ہیں۔ سورۂ یوسف کی آیت ۱۰۶ کے الفاظ ہیں ﴿ وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴾ "ان کی اکثریت اللہ پر ایمان نہیں رکھتی مگر کسی نہ کسی نوع کے شرک کے ساتھ"۔ شرک سے تو بچا تھا اللہ کا بندہ ابراہیم علیہ السلام کہ قرآن میں سب سے بڑی سند اسے یہ دی جاتی ہے ﴿ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴾ کیونکہ شرک سے بچنا آسان کام نہیں ہے۔ لہٰذا شرک کے مباحث پر غور و فکر کے ذریعے قدم قدم پر شرک سے بچنے کے لیے اللہ سے توفیق طلب کی جائے۔

قرآن کی دعوت

اب چونکہ عمل کی راہ ہموار ہو چکی ہے اس لیے مختصر الفاظ میں قرآن کی دعوت سامنے رکھ رہا ہوں' تاکہ معلوم ہو جائے کہ اللہ ہم سے کیا چاہتا ہے۔ تاہم آج میں ایک اور ترتیب سے بات آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔ اس لئے کہ ع "اِک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں" کے مصداق بے شک بات ایک ہی ہو لیکن ذرا ترتیب بدلے تو یہ اسلوب قرآن سے مطابقت رکھتا ہے۔ سب سے پہلے دیکھتے ہیں کہ قرآن کی پوری دعوت کو اگر ایک لفظ میں بیان کرنا ہو تو وہ کیا ہے؟ وہ ہے "عبادتِ رب"۔ چنانچہ فرمایا : ﴿ اُعْبُدُوْا رَبَّكُمْ ﴾ "اپنے رب کی بندگی کرو"۔ ﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴾ "اور ہم نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی بندگی کے لیے ہی پیدا کیا ہے۔" رسولوں نے کہا ﴿ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ﴾ "یہ کہ اللہ کی بندگی کرو' تمہارا کوئی معبود اس کے سوا نہیں"۔ لیکن اس عبادت کے لیے شرط ہے ﴿ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ﴾ کہ اس کے لئے اپنی اطاعت کو خالص کر لو' ورنہ وہ عبادت اللہ کے ہاں منظور نہیں' قبول نہیں۔ اس بندگی کا جو ہر دُعا ہے جیسا کہ احادیث میں آیا ہے ((اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ)) اور ((اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ)) یہ دُعا بھی ﴿ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ﴾

ہو تو بندگی ہے۔

اب اگر کوئی شخص ایسی جگہ رہتا ہے جہاں اللہ کا دین غالب ہے تو اس کی عبادت (اللہ کی بندگی) سو فیصد ہو سکتی ہے' اجتماعی زندگی میں بھی اور انفرادی زندگی میں بھی ـــــ لیکن اگر طاغوت غالب ہے اور غیر اسلامی نظام قائم ہے' تو اب ﴿ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ﴾ کا تقاضا پورا کرنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ یہ جو انفرادی زندگی میں جزوی عبادت کر رہا ہے اور باقی اجتماعی معاملات میں بندگی رب نہیں کر رہا' اس کا کفارہ ادا کرے اور اس نظام کو بدلنے کے لئے تن من دھن وقف کر دے۔ اگر یہ کریں گے تو عبادت قبول ہو گی ورنہ نہیں۔ گویا ایک لفظ "عبادت" کے اندر پورے قرآن کی دعوت موجود ہے جس کی وضاحت قرآن میں یوں آئی ہے ﴿ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ ﴾ (البیّنۃ : ۵) یعنی اپنی عبادت اور پرستش کو جب اللہ کے لئے خالص کرتے ہوئے کرو گے تب اگر نماز پڑھو گے اور زکوٰۃ دو گے تو وہ قبول ہو گی ورنہ نہیں۔ گویا شرطِ اول یہ ہے۔

اب ایک اور انداز سے دیکھتے ہیں کہ کیا قرآن کی دعوت دو الفاظ میں بھی آئی ہے؟ سورۃ الحدید میں آتا ہے ﴿ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ﴾ (آیت ۷) یہاں دو الفاظ آئے ہیں "اٰمِنُوْا وَاَنْفِقُوْا" کہ "ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور کھپا دو' صرف کر دو جو کچھ بھی ہم نے تمہیں دیا ہے" یعنی تمہارا جسم' تمہاری طاقت' ذہانت' صلاحیت' قوت' وقت' سب اللہ کے لئے کھپا دو۔ یا قرآن میں دو لفظ اور آتے ہیں "اٰمِنُوْا" اور "جَاهِدُوْا"۔ کُل دین ان دو الفاظ میں آ گیا ہے۔ فرمایا : ﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ﴾ (الحجرات : ۱۵) "مومن تو بس وہی ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر' پھر شک میں نہ پڑے اور انہوں نے اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کیا"۔ سورۃ الصف میں فرمایا ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ○ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ﴾ "اے ایمان والو! کیا میں بتاؤں تم کو وہ تجارت جو تمہیں دردناک عذاب سے بچا دے؟ تم ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسولؐ پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی

جانوں سے"۔ یہاں جہاد سے مراد بھی اپنی جان اور مال کھپا دینا ہے۔ اس طرح "ایمان اور جہاد" ـــــ اور ـــــ "ایمان اور انفاق" دو دو الفاظ میں کل دعوت آگئی ہے۔

اس سے آگے چلئے' چار چار الفاظ میں بھی دعوت دی گئی۔ سب سے پہلے سورۃ العصر کو لیجئے : ﴿ وَالْعَصْرِ ○ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ○ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ○ ﴾ "زمانے کی قسم ہے' تمام انسان گھاٹے اور خسارے میں ہیں' سوائے ان کے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے اور حق کی ایک دوسرے کو وصیت کی اور صبر کی ایک دوسرے کو وصیت کی"۔ سورۃ الحج کے آخر میں آیا ہے : ﴿ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْکَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّکُمْ وَافْعَلُوا الْخَیْرَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ○ ﴾ "اے اہل ایمان رکوع کرو' سجدہ کرو' اچھے کام کرو اور اپنے رب کی بندگی کرو تاکہ تم فلاح پاؤ"۔ سورۃ الاعراف میں رسول اللہ ﷺ کے بارے میں آیا : ﴿ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْ اُنْزِلَ مَعَهٗ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴾ "جو لوگ آپ پر ایمان لائیں گے' آپ کا احترام اور تعظیم کریں گے' آپ کی مدد کریں گے اور جو نور آپ کے ساتھ نازل کیا جائے گا اس کی پیروی کریں گے' وہ ہوں گے فلاح پانے والے"۔ سورۂ آل عمران کی آخری آیت ہے : ﴿ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ ○ ﴾ "اے اہلِ ایمان صبر کرو اور صبر میں (تمہارے دشمن جن سے تمہارا مقابلہ ہے ان سے) بازی لے جاؤ' (وہ بھی صبر کر رہے ہیں اپنے معبودانِ باطل کے لئے' اپنے نظامِ باطل کے لئے' اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے' تم ان سے صبر میں بڑھ جاؤ) اور منظم جماعت کی شکل میں مربوط رہو' جڑے رہو اور تقویٰ اختیار کرو تاکہ تم فلاح پاؤ"۔

اس کے علاوہ قرآن مجید میں لمبی لمبی بحثیں بھی آئی ہیں' مثلاً سورۃ التغابن' سورۃ الحدید' سورۃ الصّف' سورۃ الحجرات اور سورۃ الحج کے آخری حصے میں قرآن کی دعوت کھول کر بیان کر دی گئی ہے تاکہ کوئی کہہ نہ سکے کہ بات واضح نہیں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : ﴿ مَا فَرَّطْنَا فِی الْکِتٰبِ مِنْ شَیْءٍ ﴾ "ہم نے اس قرآن میں کوئی کمی نہیں رکھی ہے" کہ جس سے تم کہہ سکو کہ بات واضح نہیں ہے۔ اب جبکہ ہر شے واضح ہو گئی ہے تو ﴿ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَهٗ یُؤْمِنُوْنَ ﴾ کے مصداق قرآن کے بعد ہم کس بات پر ایمان

لائیں گے؟ آخر ہمیں کس چیز کا انتظار ہے؟ قرآن کی آیات ہمیں پکار پکار کر مخاطب کر رہی ہیں : ﴿ اَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ﴾ (الحدید : ١٦) "کیا ابھی وقت نہیں آیا اہل ایمان کے لئے کہ ان کے دل جھک جائیں اللہ کی یاد میں اور جو کچھ حق میں سے نازل ہو چکا ہے اس کے سامنے"۔ یہ تاخیر' یہ تعویق کس لئے۔ پہلے یہ کر لیں' وہ کر لیں' اس کے بعد سوچیں گے' یہ میں ذرا اس ذمہ داری سے فارغ ہو لوں۔ ع "کارِ دنیا کسے تمام نہ کرد" دنیا کا کام تو کبھی ختم ہوتا ہی نہیں اور جب آدمی دنیا سے چلا جاتا ہے تو دنیا میں کوئی کمی نہیں آتی' حالانکہ آدمی سمجھتا ہے کہ میرے بغیر تو یہ کام چل ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ چلا جاتا ہے اور کام چلتا رہتا ہے۔ ؎

یہ چمن یونہی رہے گا اور ہزاروں جانور
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اُڑ جائیں گے!

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رَبِّ العالمین ○○

خلافت کی اصل حقیقت اور اس کا تاریخی پس منظر
اور عہد حاضر میں اس کے دستوری و قانونی اور معاشی و معاشرتی ڈھانچے اور اس کے قیام کے لئے سیرت نبویؐ سے ماخوذ طریق کار کی تشریح پر مشتمل

ڈاکٹر اسرار احمد

داعی تحریک خلافت پاکستان
کے چار جامع خطبات کا مجموعہ' بعنوان :

خطبات خلافت

شائع کردہ : مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

تحریک رجوع الی القرآن کے فروغ میں
مرکزی انجمن خدام القرآن کا حصہ

مرکزی انجمن کے ۲۶ ویں سالانہ اجلاس کے موقع پر
صدر مؤسس ڈاکٹر اسرار احمد کا اختتامی خطاب

خطبہ مسنونہ' تلاوتِ آیات اور ادعیۂ ماثورہ کے بعد فرمایا :

محترم وابستگانِ انجمن و دیگر معزز حاضرین! انجمن کا سالانہ اجلاس اصل میں ضابطے کی کارروائی کے تحت منعقد ہوتا ہے۔ لہٰذا اس میں کسی دعوتی یا تبلیغی تقریر کا موقع ہوتا ہے نہ ہی کسی علمی یا تحقیقی بات کا۔ لیکن چونکہ یہ ایک رسم ہے کہ اختتام پر کچھ نہ کچھ کلمات ضرور کہے جائیں اس لئے سب سے پہلے میں اس اجلاس کے آغاز میں جو سورۃ الحشر کے آخری رکوع کی آیات تلاوت ہوئیں ان پر کچھ گفتگو کرنا چاہوں گا' کیونکہ یہ قرآن مجید کے بڑے نمایاں مقامات میں سے ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کا سب سے بڑا گلدستہ وارد ہوا ہے' ورنہ اکثر آیات میں دو دو اسماء یا صفات کا ذکر ہوتا ہے' صرف دو مقامات (سورۃ الحدید اور سورۃ الجمعہ) ایسے ہیں جہاں چار اسماء آئے ہیں' لیکن اس مقام پر سولہ اسمائے حسنیٰ ایک گلدستے کی شکل میں اکٹھے آئے ہیں۔

ایک خاص نکتے کی طرف میرا ذہن متوجہ ہوا ہے کہ اس رکوع میں سات آیات ہیں جن میں سے پہلی تین آیات کا تعلق انسانوں سے ہے' جہاں انسان کو تقویٰ اختیار کرنے اور اپنی حقیقت پہچاننے کی طرف متوجہ کیا گیا ہے ع "اپنی خودی پہچان' او غافل انسان!" کیونکہ انسان صرف جسم اور جان ہی کا مرکب نہیں ہے بلکہ کوئی اور معنوی حقیقت بھی اس میں پنہاں ہے۔ آخری تین آیات کا تعلق ذات باری تعالیٰ سے ہے ـــــ اور ان دونوں کو ملانے والی چیز قرآن مجید ہے جس کا ذکر اس رکوع کی وسطی یعنی چوتھی آیت میں آیا ہے : ﴿ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۭ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝ ﴾ یہ وہ آیت ہے کہ

جس کے بارے میں' میں کہا کرتا ہوں کہ اس آیۂ مبارکہ میں اللہ کے کلام کی عظمت فی نفسہٖ بیان کی گئی ہے۔ ایک ہوتی ہے کسی شے کی افادیت اور ایک اس کی اپنی جگہ پر عظمت ہوتی ہے۔ "کلام اللہ" کی افادیت پر تو بہت سی آیات ہیں کہ یہ کس کس پہلو سے مفید ہے اور یہ کس کس پہلو سے تبدیلی لاتا ہے۔ لیکن فی نفسہٖ اس کی عظمت کیا ہے' اس پر پورے قرآن مجید میں یہ واحد آیت ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات ہمارے ادراک و شعور سے ماوراء ہے اسی طرح عظمت قرآنی کا فہم بھی انسانی فہم سے بالاتر اور ماوراء ہے' اسی لئے اس آیت میں قرآن کی عظمت کو تمثیلی انداز میں سمجھایا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا : ﴿ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴾ جو حقائق انسانی ذہن کی گرفت سے ماوراء ہوں اور اس کا کچھ نہ کچھ اجمالی سا تصور دینا بھی انسانوں کے لئے ضروری ہو' وہاں قرآن تمثیلات کا پیرایہ استعمال کرتا ہے کہ "مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ" کے اصول کے تحت بات اگر پوری سمجھ میں نہیں آسکتی تو ساری کو ترک بھی نہ کیا جائے۔ تاکہ ان حقائق کا کچھ ادراک تو حاصل ہو سکے۔ اسی طرح قرآن کی عظمت کو بھی اس آیت میں تمثیل کے ذریعے سمجھایا گیا ہے کہ "اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر اُتار دیتے تو تم دیکھتے کہ وہ دب جاتا اور پھٹ جاتا اللہ کی خشیت سے"۔

اس کو بھی اکثر و بیشتر لوگ سمجھ لیتے ہیں کہ شاید یہ کوئی استعارے اور محاورے کے انداز میں بات کہہ دی گئی ہے۔ لیکن یہ بات تب کہی جا سکتی تھی اگر قرآن میں وہ واقعہ موجود نہ ہوتا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے درخواست کی تھی ﴿ رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ﴾ کہ پروردگار مکالمہ سے تو کئی بار مشرف ہو چکا ہوں لیکن اب میرے اندر تیری دید اور تیرے دیدار کی خواہش روکے نہیں رکتی۔ جس پر جواب ملا : ﴿ لَنْ تَرٰىنِيْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ﴾ "تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے' لیکن اس پہاڑ کو دیکھو (اس پر ہم اپنی تجلی ڈالیں گے) اگر وہ (اسے سہار گیا اور) اپنے مقام پر کھڑا رہ گیا تو تم بھی مجھے دیکھ سکو گے"۔ ﴿ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ﴾ یہ محض کوئی پیرایۂ بیان نہیں ہے' کوئی استعارہ نہیں ہے "جب اس کے رب نے اپنی تجلی اس پہاڑ پر ڈالی تو وہ پھٹ گیا اور ریزہ ریزہ ہو گیا اور موسیٰ (اس بالواسطہ تجلی باری تعالیٰ کے مشاہدے سے) بے ہوش ہو کر گر پڑے"۔ چنانچہ جو عظمت "تجلی ذاتِ

باری تعالیٰ" کی ہے وہی عظمت قرآن حکیم کی بھی ہے۔

جیسا کہ میرا موقف ہے کہ علامہ اقبال عظمت قرآن کے بہت بڑے عارف تھے' بلکہ دورِ حاضر کے بارے میں تو میں بلاخوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ علامہ اقبال سے بڑھ کر قرآن کی عظمت کا ادراک کسی کو حاصل نہیں تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ مفسرین' لغت ہائے مجازی کے قارون اور روایات کے حافظ تو بہت سے ہو سکتے ہیں لیکن عظمت قرآن کا ادراک اور اس کا انکشاف علامہ اقبال پر جن مختلف پہلوؤں سے ہوا ہے میرے سامنے اس کی کوئی دوسری مثال نہیں۔ چنانچہ اس مضمون کو اقبال نے بڑی خوبصورتی سے انتہائی نازک پیرائے میں بیان کیا ہے ؎

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

"صاف ہی کہہ دوں جو میرے دل میں چھپا ہوا ہے کہ اس قرآن کو کوئی کتاب نہ سمجھ بیٹھنا' یہ کچھ اور ہی شے ہے"۔

ایک اور شعر میں قرآن اور ذات باری تعالیٰ کے تعلق کو یوں واضح کیا ہے ؎

مثل حق پنہاں و ہم پیداست ایں
زندہ و پائندہ و گویاست ایں

"ذاتِ باری تعالیٰ کی مانند یہ قرآن ظاہر بھی ہے اور پنہاں بھی ہے۔ یہ جیتی جاگتی بولتی ہوئی کتاب ہے اور ہمیشہ قائم رہنے والی بھی ہے"۔

یعنی ایک اعتبار سے یہ انتہائی ظاہر ہے اور اس پر تذکر کرنا بہت آسان ہے' اس سے نصیحت اخذ کرنا نہایت سہل ہے۔ اس کے لئے صرف اتنی عربی ضروری ہے کہ درمیان میں ترجمے کا حجاب نہ رہے' لیکن اس کی گہرائیوں اور پنہائیوں کا اندازہ تو انسان کر ہی نہیں سکتا۔ ناممکن ہے کہ کوئی اس کی تہہ تک پہنچ سکے' اس کی کوئی تہہ ہے ہی نہیں۔ اس تک پہنچنے کا کوئی امکان ہی نہیں۔ کیونکہ قرآن "کلام ربانی" ہونے کے اعتبار سے "صفت الٰہی" ہے اور اللہ کی ساری صفات اس قرآن میں ہیں۔

اس مقام پر ذہن اس طرف منتقل ہوا ہے کہ الحمدللہ جو کام ہم نے شروع کیا تھا وہ اب عربی زبان کی کلاسز اور فہم قرآن کے کورسز کی شکل میں اللہ کے فضل و کرم سے

ہمارے معاشرے میں عام ہو رہا ہے۔ یہ ایک اچھی علامت ہے اور معاملہ امید افزا ہے۔ ؎

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں!

ایک زمانہ تھا کہ اس شہر لاہور میں درس قرآن کا کوئی حلقہ موجود نہیں تھا' صرف غلام احمد پرویز کا مختصر سا حلقہ درس ہوا کرتا تھا لیکن وہ بھی امت کے سوادِ اعظم کے تصورات سے ہٹ کر تھا۔ آج بڑے پیمانے پر لوگ آگے آئے ہیں۔ اور اس سمت میں جو بھی کام آگے بڑھ رہا ہے اس میں ہمیں بھی اجر و ثواب ملے گا' کیونکہ اللہ کے ہاں تو سپر کمپیوٹرز ہیں۔ وہاں سب حساب کتاب موجود ہے کہ کس کام کو کس نے شروع کیا تھا۔

آج میں جس بات کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ صرف عربی سیکھنا اور قرآن کا ترجمہ سمجھ لینا ہی مقصود نہیں ہے۔ اگرچہ اس سے بعض چیزیں حاصل ہو جائیں گی اور وہ بھی بہت بڑا نفع ہے' کیونکہ اس سے جاہلیت قدیمہ کے مشرکانہ اوہام کی جڑ کٹ جائے گی اور فرقہ پرستی کی تلخی بھی نہ صرف کم ہو گی بلکہ ختم ہو گی' لیکن یہ اس دور کے مسئلے کا اصل حل نہیں ہے۔ اور میں حیران ہوں کہ اس اعتبار سے علامہ اقبال کی نگاہ کہاں تک پہنچی ہے کہ ؎

تُو عرب ہو یا عجم ہو تیرا لا الٰہ اِلاّ
لغت غریب جب تک تیرا دل نہ دے گواہی

یعنی یہ کہ عربی زبان جاننے سے کچھ نہیں ہوتا۔ سارے کے سارے عرب جن کے سامنے حضور قرآن پیش کر رہے تھے وہ عربی جاننے والے ہی تو تھے۔ اور آج جو عرب دنیا ہے اس کی اکثر و بیشتر صورت حال یہ ہے کہ عربی ان کی مادری زبان ہے' لیکن قرآن مجید کے عربی زبان میں ہونے کے باوجود قرآن کے اور ان لوگوں کے ذہنوں کے مابین حجابات طاری ہو گئے ہیں۔ یہ حجاباتِ علمیہ ہیں' یعنی غلط نظریات' غلط اقدار' غلط سائنسی تصورات نے درمیان میں آکر جھاڑ جھنکاڑ کھڑا کر دیا ہے' جس کے باعث قرآن مجید کے ساتھ ذہن کی ہم آہنگی نہیں ہو پاتی اور جب تک ذہن ہی کی ہم آہنگی نہیں ہو گی تو دل بیچارہ کیا کرے گا۔ کیونکہ دل تک کوئی بات ذہن کے Barrier سے گزر کر پہنچتی ہے۔ البتہ عوام الناس

سادہ لوح ہوتے ہیں' انہیں ان افکارِ علمیہ سے کوئی تعلق' کوئی دلچسپی نہیں ہوتی' ان کے دل clean slate کی مانند صاف ہوتے ہیں' اس لئے آپ آسانی سے ان کے قلوب تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ کسی معاشرے کے اصل فیصلہ کن عنصر نہیں ہیں' وہ تو معاشرے کے ہاتھ پاؤں ہیں' جو صرف بھاگ دوڑ کر سکتے ہیں' جبکہ ان کو کنٹرول کرنے والی تو ذہین اقلیت (Brain Trust) ہوتی ہے۔ یہ حجاباتِ علمیہ اس ذہین اقلیت کے راستے میں حائل ہیں۔ آج کا مسئلہ یہ ہے کہ اس کا علاج کیا جائے۔

جہاں تک معاملہ سائنس اور مذہب کا ہے اس میں تدریجاً کام ہو رہا ہے۔ میرے علم کی حد تک برعظیم پاک و ہند میں اس کام کو شروع کرنے والے ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم ہیں جنہوں نے علامہ اقبال کے فکر کے تحت قرآن اور سائنس کو ایک دوسرے کے قریب لا کر ان میں باہمی ربط قائم کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ اس ضمن میں ہمارا بھی حصہ ہے' لیکن اکثر و بیشتر چیزیں بعد میں جا کر نمایاں ہوتی ہیں' زندگی میں کسی شخص کا contribution نمایاں نہیں ہوتا۔ لیکن میں مطمئن ہوں کہ مابعد الطبیعیات کے جو اعلیٰ ترین سطح کے مسائل ہیں اور پھر سائنس کے حوالے سے کہ اس کائنات کا genesis کیا ہے؟ تخلیق کائنات کے نظریات کیا ہیں؟ یہ Big Bang کیا ہے اور Big Crunch کیا ہوگا؟ اسی طرح روح کیا ہے اور ملائکہ' ارواح انسانی اور وحی کی حقیقت کیا ہے؟ ان مسائل پر میں سمجھتا ہوں کہ الحمدللہ ہم نے اتنا کام کر لیا ہے کہ میں اپنی جگہ بالکل مطمئن ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں ایک سالہ کورس میں جو ایم ایس سی' ڈاکٹرز' انجینئرز اور پی ایچ ڈی حضرات آتے ہیں ان میں سے آج تک یہاں سے کوئی اشکال لے کر نہیں گیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ بات پوری طرح واضح ہے اور ان مسائل کی جو تشریح قرآن و حدیث کی روشنی میں اللہ نے ہم سے کرائی ہے اس پر علمی سطح پر اطمینان کی کیفیت ہے۔ البتہ خاص فلسفے اور یعنی عمرانی علوم (Social Sciences) کے میدان میں میری کوئی پہنچ نہیں ہے۔ لیکن ان معاملات کے لئے بھی الحمدللہ ہمارا ایک حلقہ وجود میں آ گیا ہے۔ امریکہ میں ہمارے نوجوان رفیق باسط بلال نے Institute of Quranic Wisdom کے نام سے ایک حلقہ پیدا کر لیا ہے جس کے تحت "Event Horizon" کے نام سے ایک پرچہ بھی شائع ہو رہا ہے اور اس کے

ذریعے وہاں کی اونچی سطح کے مفکرین تک ہمارا فکر تیزی کے ساتھ پہنچ رہا ہے۔ باسط بلال نے میرے ایک کتابچے "عظمت صوم" کا ترجمہ کر کے Event Horizon میں شائع کیا ہے، جس میں یہ موضوعات زیر بحث لائے گئے ہیں کہ انسان کی حقیقت کیا ہے؟ اس کا ایک مادی اور حیوانی وجود ہے اور ایک روحانی وجود ہے۔ الحمدللہ اس نظریے کو ان حلقوں میں بڑی پذیرائی حاصل ہو رہی ہے، کیونکہ ان کے لئے تو یہ بالکل نئی باتیں ہیں اور یہی وہ چیزیں ہیں کہ جن کی وجہ سے مذہب اور سائنس میں تقسیم (dichotomy) ہو گئی ہے۔ یعنی ایک طرف نظر آتا ہے کہ عقیدہ اور مذہب بالکل علیحدہ شے ہے جبکہ دوسری طرف سائنس کوئی علیحدہ شے ہے اور ان کے مابین کوئی پل قائم کرنا ممکن ہی نہیں۔ الحمدللہ ہم نے سائنسی حقائق اور قرآنی حقائق کی دوری کو ختم کر دیا ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے ہمارے مفکرین نے ان مسائل سے صرف نظر کیا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے نظریہ ارتقاء کے بارے میں مولانا مودودی مرحوم کی تشریح کے بارے میں ایک جملہ کہا ہے "Its a positive disservice to the cause of Islam" اس لئے کہ خالصتاً dogmatic انداز اختیار کر کے اتنے بڑے نظریے کے اوپر صرف پھبتیاں چست کر کے کام چلا لینا ٹھیک نہیں ہے۔

اس کے ساتھ جو میں یہ کہتا ہوں کہ اس ارض پاکستان سے ہی اصل اسلام کا احیاء ہونا ہے تو اصل اسلام سے مراد موجودہ دور کا اسلام ہے جو اس دور کے تقاضوں اور روحِ عصر سے ہم آہنگ ہو۔ کیونکہ ایران میں جو اسلام آیا ہے وہ اس دور کا اسلام نہیں ہے، وہ آج سے کئی صدیوں پہلے کا ملائی نظام ہے۔ اسی طرح افغانستان میں جو اسلامی نظام آ رہا ہے وہ بھی درحقیقت کئی صدیوں پہلے کا فقہی اسلام ہے۔ اس دور کے مثالی اسلام کے لئے اللہ نے یہی سرزمین منتخب کی ہے۔ الحمدللہ اس کی طرف پیش قدمی ہو رہی ہے، چاہے وہ چیونٹی کی چال سے ہو رہی ہے، لیکن ہم ادھر ہی جا رہے ہیں۔ اس کے میں جو شواہد پیش کرتا ہوں ان میں اس کو بھی شامل کر لیجئے کہ "سائنس اور قرآن" اور "عقیدہ اور ایمان" کو جوڑنے کے عمل کو الحمدللہ اس سرزمین میں پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی خدمت اللہ نے ہم سے لی ہے اور جہاں تک عمرانی علوم کے حوالے سے فکری تعلق ہے الحمدللہ اس کی داغ بیل بھی پڑ چکی ہے۔

آج سے چھ سال قبل میں نے تقریر کی تھی' اس کے حوالے سے میں چاہتا ہوں کہ اس مقام پر دو نکات کا تذکرہ کر دوں۔ ان دو چیزوں کو قرآن نے بیان کیا ہے۔ سورۃ الصف میں ارشاد ربانی ہے : ﴿ يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ﴾ اور اگلی آیت میں آتا ہے : ﴿ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴾ ایک ہے کہ "اتمامِ نور" کہ اللہ اپنے نور کا اتمام فرما کر رہے گا۔ وہ تو حضور کے زمانے میں ہو گیا۔ یعنی قرآن کے ذریعے اتمامِ نعمت ہدایت کر دیا گیا۔ دوسرا ہے "اظہار دین الحق" یعنی دین کو غالب کرنا۔ دونوں آیات کے آخر میں ہے کہ خواہ یہ کفار اور مشرکین کو کتنا ہی ناگوار محسوس ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان دونوں کے مابین کوئی بہت اہم منطقی ربط و تعلق ہے' اور الحمدللہ ہم نے اپنی دعوت و تحریک کے یہی دو پہیے قرار دیئے ہیں۔ ایک دعوت رجوع الی القرآن' کیونکہ جہاں تک قرآن کا تعلق ہے اس کا اتمام ہو چکا' اب تو ہمیں اس کا افشاء کرنا ہے' جس کی حدیث میں بھی ترغیب دی گئی ہے کہ ((وَافْشُوْهُ)) "اسے عام کرو' پھیلاؤ" اور ((خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ)) "تم میں سے بہترین وہ ہے جس نے قرآن سیکھا اور اسے دوسروں کو سکھایا"۔ قرآن مکمل اور کامل ہے اور اللہ نے اس کی حفاظت کا ذمہ بھی لے لیا ہے' اب صرف اس کا افشاء و اعلان ہے' اس کی تعلیم ہے اور فرمان نبویؐ ((بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ اٰيَةً)) کے تحت اس کو پھیلانا ہے' اس کی تبلیغ کرنی ہے۔ اس کام کے لئے انجمن خدام القرآن قائم کی گئی جو درحقیقت گاڑی کا ایک پہیہ ہے' لیکن اس کے برابر کا لازمی پہیہ "اظہار دین الحق علی الدین کلہ" کی جدوجہد ہے۔ یہ دونوں پہیے اگر ساتھ نہیں ہیں تو پھر یہ معاملہ نتیجہ خیز نہیں ہے۔

اس ضمن میں بھی ہمیں علامہ اقبال کے ساتھ دو نسبتیں حاصل ہیں' ایک یہ کہ انہوں نے دارالاسلام (پٹھانکوٹ) بنوایا' چاہے وہ اس نہج پر نہیں چل سکا' لیکن اس کی کوئی عملی شکل قائم ہوئی ہے تو وہ قرآن اکیڈمی کی صورت میں ہوئی ہے۔ یعنی علامہ اقبال نے ۳۷ء میں جس ضرورت کا اظہار فرمایا ۷۷ء میں اس ادارے کا آغاز ہمارے ہاتھوں قرآن اکیڈمی کی صورت میں ہوا۔ اور یہاں سے سینکڑوں گریجویٹس' پوسٹ گریجویٹس' Ph.D. حضرات اسلام کا صحیح فکر لے کر گئے ہیں۔ اس کے علاوہ علامہ اقبال کے ذہن میں

دوسرا نقشہ بھی تھا' اگرچہ اس سلسلے میں وہ کوئی اقدام نہیں کر سکے تھے لیکن اب وہ راز کھل کر سامنے آگیا ہے' جسے ہم نے ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی کتاب سے لے کر "علامہ اقبال کی آخری خواہش" کے نام سے ایک کتابچہ کی صورت میں شائع کر دیا ہے کہ وہ اقامت دین کے لئے بیعت کی بنیاد پر "جمعیت شبان المسلمین ہند" کے نام سے ایک تنظیم قائم کرنا چاہتے تھے' جس میں سمع و طاعت اور دین کی پابندی لازمی تھی۔ چنانچہ انہی بنیادوں پر ہم نے تنظیم اسلامی قائم کی ہے جس کا مقصد "اقامت دین" ہے اور جو گاڑی کا دوسرا پہیہ ہے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا مقصد صرف قرآن کی دعوت اور تبلیغ ہی نہیں تھا' بلکہ دین کو قائم کرنا تھا اور آج سے چودہ سو برس قبل رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں جو انقلاب عظیم برپا ہوا ہے اس کا آلہ یہی قرآن تھا۔ قرآن کے ذریعے تذکیر اور تبشیر اپنی جگہ پر ہے' لیکن اس کا اصل مقصد انقلاب برپا کرنا ہے ؎

اے چوں شبنم بر زمیں افتندۂ
در بغل داری کتاب زندۂ

تاہم اس کتاب کی خدمت کی جو توفیق بھی آپ کو یا مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملی ہے اس پر ہم سب کو شکر ادا کرنا چاہئے اور اس کے لئے ع "ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں" کے مصداق انفاق' محنت و مشقت اور جذبے میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جانا چاہئے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ بیعت کی مسنون بنیاد پر قائم جماعت میں شامل ہو کر اقامت دین کی ذمہ داری کو پورا کرنے کی طرف بھی توجہ کرنی چاہئے۔ یہ بات ہمارے تجربے میں رہی ہے کہ انجمنوں کے انتخابات ہوتے ہیں تو اس میں لوگوں کی آستینیں چڑھی ہوئی ہوتی ہیں' مقابلے ہوتے ہیں' لیکن اللہ کا فضل ہے کہ ہماری انجمن میں کبھی ایسی نوبت نہیں آئی۔ یہ زمین و آسمان کا جو فرق ہے' اس کا اصل سبب یہی ہے کہ ہم نے انجمن کے قیام کے وقت سنت نبوی کا ایک عکس اپنے دستور میں شامل کیا تھا۔ اصل سنت نبوی بیعت ہے' لیکن جب میں نے انجمن قائم کی تھی تو کہا تھا کہ میرا اصل مقصود انجمن قائم کرنا نہیں ہے بلکہ بیعت کی بنیاد پر اقامت دین کے لئے جماعت بنانا پیش نظر ہے۔ ایسی جماعت کا قیام تو اُس وقت ممکن نہ ہو سکا' لیکن انجمن کے دستور میں ایک شق رکھی گئی جس کے تحت صدر مؤسس کو ویٹو کا حق دیا گیا' اگرچہ وہ حق آج تک استعمال کرنے کی

نوبت نہیں آئی' لیکن اس کی برکت سے انجمن کا کام اللہ کے فضل و کرم سے ایسا چل رہا ہے کہ کبھی کوئی جھگڑا' دنگا' فساد نہیں ہوا بلکہ لوگوں کو پکڑ پکڑ کر لانا پڑتا ہے کہ آپ اس کی شوریٰ میں شامل ہو جائیں۔ یہ صرف سنت نبوی کے ایک حصے پر عمل کی برکت ہے۔ اگر حضور ﷺ کی زندگی کے مقصد "اظہار دین الحق" کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا جائے تو کیا کچھ برکات اور اللہ کی نصرتیں حاصل ہوں گی ؎

مری زندگی کا مقصد ترے دیں کی سرفرازی
میں اسی لئے مسلماں ' میں اسی لئے نمازی

اس کے علاوہ میں یہ کہنا چاہوں گا کہ انجمن کے کاموں میں participation صرف چندہ دینا نہیں ہے' اگرچہ آج کل ملک کے معاشی حالات میں خرابی کے باعث اس کی بھی کمی محسوس ہو رہی ہے۔ اس لئے اس کام کو مزید آگے بڑھایئے' انجمن کے کاموں میں دلچسپی لیجئے' مجالس میں شرکت کیجئے' تاکہ جانی یا مالی کسی قسم کے تعاون میں کسی مرحلے پر کمی محسوس نہ ہو۔

آج کے اجلاس میں پچھلی کارروائی پڑھی گئی' جس میں محسنین اور مؤسسین کا تذکرہ ہوا۔ ان حضرات کے بارے میں میرے دل میں ہوک اُٹھتی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ ایک عمارت جب بن کر تیار ہو جاتی ہے تو اس کی بنیاد زمین میں چھپ جاتی ہے' کچھ پتا نہیں چلتا کہ وہ کہاں ہے' کیسی ہے۔ ساڑھے چھبیس برس قبل صرف آٹھ افراد نے ایک دستاویز پر دستخط کئے تھے جن کے حوالے سے انجمن کی رجسٹریشن ہوئی تھی۔ اگرچہ مؤسسین کی تعداد بیس تھی جنہوں نے ابتدائی طور پر پانچ پانچ ہزار روپے پیش کئے تھے' لیکن انجمن کی رجسٹریشن آٹھ دستخطوں سے ہوئی تھی۔ ان میں ایک دستخط کرنے والا میں بھی ہوں اور جو بقیہ سات تھے اس وقت ان میں سے صرف ایک ساتھی خادم حسین صاحب یہاں موجود ہیں' باقی سات حضرات یہاں موجود نہیں ہیں۔ پھر یہ کہ جو بیس مؤسسین تھے ان میں سے کئی حضرات اس عالم فانی سے کوچ کر گئے ہیں' جیسے ڈاکٹر یقین کے والد شیخ محمد یٰسین صاحب' ساہیوال سے تعلق رکھنے والے شیخ منظور الحق صاحب اور لاہور سے تعلق رکھنے والے چوہدری نصیر احمد وِرک صاحب۔ میں یہ نام اس لئے لے رہا ہوں کہ آج ہم ان کے لئے دعائے مغفرت کریں اور ان کی یاد کو تازہ کریں۔ کیونکہ انہوں نے ابتدا میں اس

کام کے لئے وقت لگایا' محنت کی' کوشش کی۔ اس لئے آج ہم احسان مندی کے جذبے کے ساتھ ان کا قرض ادا کرتے ہوئے ان کے لئے دعا کریں۔ اسی طرح میرے چھوٹے بھائی اقتدار احمد مرحوم بھی مؤسسین میں سے تھے اور بہت فعال تھے۔ کراچی کے ڈاکٹر عبداللطیف خان بھی ہمارے مؤسسین میں شامل تھے۔

پھر ہمارے دو بزرگ حضرات ایسے ہیں جو بہت فعال رہے ہیں لیکن کچھ عمر کا تقاضا اور کچھ حوادث زمانہ کے اعتبار سے اب وہ بہرحال فعال نہیں ہیں' جن میں شیخ محمد عقیل صاحب کا دم غنیمت ہے کہ وہ ہمارے ساتھ چل رہے ہیں' اِس وقت ان کی اہلیہ صاحبہ شدید علیل ہیں' ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے' اس کے اثرات بھی ان پر پڑ رہے ہیں' اس پر یہ مستزاد یہ کہ ان کی عمر بھی ۸۳ برس ہے۔ اگرچہ وہ انجمن کے تو "مؤسسین" میں سے ہیں لیکن میں ذاتی طور پر انہیں اپنے محسنین میں شمار کرتا ہوں۔ اس لئے کہ قرآن اکیڈمی کے لئے قطعہ زمین انہوں نے ہی ہبہ کیا تھا اور یہ زمین انہوں نے اس حال میں دی تھی کہ میں ان سے واقف بھی نہیں تھا۔ وہ خود مسجد خضریٰ کے اتوار اور جمعہ کے دروس میں آتے تھے۔ اس زمانے میں دو اڑھائی سو افراد ہوتے تھے' بعد میں تعداد بڑھتے بڑھتے درس مسجد شہداء میں منتقل ہوا تو تعداد پانچ سو ہو گئی۔ ایک مرتبہ گنتی ہوئی تو شرکاء کی تعداد سات سو تھی۔ اس لئے کہ ہم نے وہاں ایک کتابچہ تقسیم کیا تھا جس کے سات سو نسخے تقسیم ہوئے تھے۔ بہرحال اس زمانے میں جبکہ دو ڈھائی سو افراد آیا کرتے تھے' میں تو سب سے واقف نہیں تھا۔ جنرل ضیاء الحق صاحب بھی سویلین لباس میں آتے تھے جس کا مجھے بہت بعد میں علم ہوا۔ اس دوران شیخ عقیل صاحب نے ایک دفعہ مجھ سے کہا کہ آپ قرآن اکیڈمی کی بات کرتے ہیں تو میرا ایک قطعہ زمین ہے وہ میں دینا چاہتا ہوں۔ میں نے سمجھا کہ شاید کوئی وقتی ساجذبہ ان کے اندر ابھرا ہو گا' اس لئے میں نے کہا کہ اگلے اتوار کو دیکھ لیں گے' اس پر انہوں نے کہا اگر آپ چاہیں تو ابھی جا کر دیکھ لیں' میں نے کہا نہیں اگلے اتوار کو آپ کے ساتھ ضرور چلوں گا۔ وہ اگلے اتوار کو موجود تھے' چنانچہ میں ان کے ساتھ گیا اور ان کی پیشکش قبول کرنا پڑی۔ بہرحال ان کے لئے اور ان کی اہلیہ صاحبہ کے لئے (جو بیمار ہیں) دعا کی جائے۔

ملک محمد بشیر صاحب بھی ہمارے ایک اور فعال ساتھی رہے ہیں۔ ان کی عمر ۸۵ برس

(باقی صفحہ ۹۶ پر)

حقیقت ایمان۔ متفرق مباحث

مرتب : ابو عبدالرحمٰن شبیر بن نور

ایمان کے ثمراتِ ظاہری

ایمان سے مُراد یہاں حقیقی ایمان ہے۔ ایمان کے ثمراتِ ظاہری کو درخت کی مثال سامنے رکھ کر سمجھا جا سکتا ہے۔ اس میں پہلے دو پتیاں ہی پھوٹتی ہیں' پھر تنا بنتا ہے' اس تنے میں سے شاخیں نکلتی ہیں اور پھر پتے' پھول اور پھل نکلتے ہیں۔ جس قدر درخت اوپر کو اٹھے گا اسی اعتبار سے اس کی جڑ مضبوط ہوتی جائے گی۔ اسی طرح جتنا ایمان مضبوط ہو گا اسی اعتبار سے عمل صالح' تواصی بالحق' تواصی بالصبر' جہاد فی سبیل اللہ' ارکانِ اسلام' اطاعت' عبادت اور وفا و فدا کاری میں نکھار آتا چلا جائے گا۔ گویا کہ یہ سارے اعمال ایمان کے ظاہری برگ و بار ہیں۔ حدیث جبریل میں جو لفظ "احسان" استعمال ہوا ہے اس سے مُراد ایمان کے ثمراتِ ظاہری کا نقطہ عروج ہے۔ ان اعمال میں جس قدر شدت' اخلاص اور عمدگی ہو گی اسی اعتبار سے درجۂ احسان میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ کیونکہ احسان کے معنی کسی کام کو عمدگی اور خوبصورتی سے ادا کرنے کے ہوتے ہیں۔ حدیث میں آیا ہے :

((وَاِذَا ذَبَحْتُمْ فَاَحْسِنُوا الذِّبْحَ))[1]

"جب جانور کو ذبح کرنا ہو تو اچھے طریقے سے ذبح کرو"۔

یعنی ہر کام بحسن و خوبی کرو' نماز پڑھو تو اچھی پڑھو۔ دین کے جو بھی کام ہیں ان میں خوبصورتی' حسن اور رعنائی ہونی چاہئے۔ حسن و خوبی کے ساتھ ساتھ ہر کام میں شدت اور گہرائی ہو تاکہ جہاد و مجاہدہ میں بھی اتنی ہی شدت ہو۔ ایثار و قربانی میں بھی شدت ہو۔ نماز میں بھی وہ کیفیت ہو کہ معراج المومن بن جائے۔ اسی کو شریعت میں احسان کا نام دیا گیا ہے اور حدیث جبریل (جس کا تذکرہ گزر چکا ہے) میں بھی احسان سے یہی کیفیت مُراد ہے۔

ایمان اور فطرت

ایمان کا اصل حاصل اور لب لباب امن ہے' اور امن سے مراد ذہنی و قلبی سکون و اطمینان ہے۔ یہ دو اعلیٰ ترین استعدادات (faculties) ہیں جو ہر انسان میں موجود ہیں جنہیں ہم دل و دماغ سے تعبیر کرتے ہیں۔ جو بھی الجھن ہوتی ہے' قلب کو صدمہ ہو' ذہن کو فکر ہو' اندیشے ہوں' سب کا تعلق انہی دو چیزوں سے ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ وہ لوگ بڑے خوش نصیب ہیں جن کے یہ دونوں اعضاء (faculties) متحد ہوں اور ان کی شخصیت منقسم (split) نہ ہو کہ دل کچھ کہہ رہا ہو اور دماغ کچھ اور کہہ رہا ہو' بلکہ دل و دماغ کے اتحاد کے ساتھ علیٰ وجہ البصیرۃ انہوں نے جو بھی راستہ اختیار کیا ہو وہ اسی پر گامزن ہوں۔

ایمان کے ذریعے ان تمام سوالات کا جواب مل جاتا ہے جن سے فلسفہ بحث کرتا ہے ـــــ مثلاً :

(۱) اس کائنات کی حقیقت کیا ہے؟

(۲) کیا یہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی؟

(۳) کیا یہ خود بخود بن گئی ہے اور خود بخود چل رہی ہے؟ یا اسے کوئی بنانے اور چلانے والا ہے؟

(۴) اس سے ہمارا کوئی ربط و تعلق ہے یا ربط الحادث بالقدیم کا سا معاملہ ہے؟

(۵) اگر یہ کائنات حادث ہے اور اس کا خالق قدیم' تو ان کے مابین ربط و تعلق کیا ہے؟

(۶) ہماری زندگی کی حقیقت کیا ہے؟ اور مبدأ و معاد کیا ہے؟[۲]

(۷) خیر کیا ہے؟ شر کیا ہے؟ یہ کوئی مستقل اقدار (values) ہیں یا ہمارا خیال ہی ہے؟
(Nothing is good or bad; only thinking makes it so.)

(۸) علم کیا ہے؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟ علم بالحواس اور علم بالعقل کو تو ہم جانتے ہیں' لیکن کیا اس سے وراء بھی کوئی ذریعۂ علم (source of knowledge) ہے؟

(۹) انسان کے محرکاتِ عمل کیا ہیں؟ آیا صرف حیوانی جبلتیں ہی ہیں یا اس سے بالاتر بھی انسانی وجود کی کوئی حقیقت ہے؟

یہ وہ بنیادی سوالات ہیں جن سے فلسفے کی مختلف شاخیں مثلاً مابعد الطبیعیات (Metaphysics)' اخلاقیات (Ethics) اور نفسیات (Psychology) بحث کرتی ہیں۔

جب سے انسان نے سوچنا شروع کیا ہے تب اہل دانش ان سوالات پر غور کرتے رہے ہیں۔ ہر دانشور نے اس کا world-view پیش کیا ہے۔ ایمان بھی درحقیقت ایک مکمل تصورِ کائنات (world-view) یا فلسفے کی جرمن اصطلاح میں (Weltanshauung) ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صرف ایمان ہی وہ تصویر کائنات ہے جو فطرت انسانی کے ساتھ کامل مطابقت رکھتا ہے۔ ایمان ہی کے ذریعے سکون' انبساط اور معرفت ملتی ہے' جس سے سارے مسائل کا حل سامنے آجاتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی جان لیں کہ نور سے انسان کو سکون ملتا ہے اور اندھیرے سے بے چینی ملتی ہے۔ کمرے میں اندھیرا ہو جائے تو آدمی بے چین ہو جاتا ہے' کچھ پتہ نہیں چلے گا کہ آگے کون ہے اور پیچھے کون؟ اس کے برعکس روشنی میں سب معلوم ہو جاتا ہے کہ آگے کیا ہے؟ پیچھے کیا ہے؟ دائیں اور بائیں کیا ہے؟

حقیقی مؤمن ہونے کی صورت میں ذہنی و قلبی اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ قلب کو دو قسم کے احساسات درپیش ہوتے ہیں' ایک کیفیت خوشی' اطمینان' انبساط اور مسرت کی ہوتی ہے جبکہ دوسری کیفیت غم' رنج' صدمہ' کرب اور دکھ کی ہوتی ہے۔ آج کی نوجوان نسل میں "وجود کا کرب" نامی فلسفہ بہت مشہور ہو رہا ہے۔

دل میں اگر رنج والم ہو تو دماغ میں اندیشے اور تشویش پیدا ہوتی ہے' جس کی مختلف شکلیں ممکن ہیں' مثلاً فلاں جانور نقصان نہ پہنچادے' سانپ نہ کاٹ لے' فلاں افسر ناراض نہ ہو جائے۔ دل کے رنج و غم اور دماغ کے اندیشے اور تشویش کو قرآن نے حزن و خوف کا نام دیا ہے۔ جب امن ہو گا تو "خوف و حزن" نہیں ہو گا۔ اور ایمان کا لازمی نتیجہ "امن" ہے یعنی زوالِ حزن و خوف۔ لہٰذا اگر کوئی انسان خوف و حزن سے نجات پالے اور اسے سکون و اطمینان مل جائے تو یہ اس کے قلبی ایمان کی نشانی ہے۔

ایمان اور تصوف

"تصوف" ایک مجہول النسب لفظ ہے۔ بہرحال مسلمانوں میں یہ اصطلاح مشہور

ہو چکی ہے اور ایک بڑے طبقے کے ہاں مقبول و معروف ہے۔ تصوف کا لفظ نہ تو قرآن حکیم میں ہے اور نہ ہی غالباً حدیث رسول اللہ ﷺ میں موجود ہے۔

لفظ تصوف کا وزن "تَفَعُّل" ہے' لیکن اس کا ثلاثی اصل کیا ہے؟ معلوم نہیں۔

کچھ لوگوں نے "تصوف" کا اصل "صوف" مانا ہے' یعنی اونی لباس' کیونکہ ابتداءً صوفیاء اپنے جسم کو تکلیف دینے اور نزاکت سے بچانے کے لئے ادنیٰ کپڑے استعمال کرتے تھے' غالباً یہی بات صحیح ہے۔ کچھ دوسرے حضرات نے "تصوف" کا اصل "صفا" قرار دیا ہے' لیکن ہماری معلومات کی حد تک "صفا" سے لفظ تصوف کسی شکل میں نہیں بنتا۔ قرآنی اصطلاح کے مطابق تصوف کا موضوع ولایت یا موالاتِ باہمی ہے۔ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا مولیٰ اور ولی ہے' فرمایا :

﴿ اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ﴾

(البقرۃ : ۲۵۷)

"جو لوگ ایمان لاتے ہیں ان کا حامی و مددگار اللہ ہے' وہ ان کو تاریکیوں سے روشنی میں نکال لاتا ہے"۔

اسی طرح اہل ایمان بھی اللہ کے ولی ہیں۔ فرمایا :

﴿ اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ ﴾

(یونس : ۶۲)

"سن لو جو اللہ کے دوست ہیں ان کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے"

تصوف کا مقصد

تصوف کا مقصد یہ ہے کہ ایمان انسان کے قال سے آگے بڑھ کر حال کی شکل اختیار کر لے۔ کسی کا زبان سے ایمان کا اقرار کرنا اور چیز ہے' لیکن ایمان انسان کے جسم پر ایک کیفیت کے ساتھ نظر آئے یہ دوسری چیز ہے اور یہی تصوف کا مقصد و منشا ہے۔

تصوف کا فلسفہ

مسلمانوں میں تصوف کے حوالے سے کچھ لوگ معروف ہوئے ہیں جیسے ہندی' فارابی' ابن سینا' ابن رشد وغیرھم' لیکن یہ تمام حضرات ارسطو کے متبعین ہیں انہوں نے ارسطو کی منطق کے حوالے سے دین کو سمجھنے کی کوشش کی' اور بڑی سخت ٹھوکریں کھائی

ہیں۔ فی زمانہ ان کے متبعین میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن [۳] کا نام بھی آتا ہے۔ "اصل میں مسلمانوں کے صحیح فلسفی صوفیاء ہیں" [۳] یہ جملہ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کا ہے (اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت کرے اور ان کی کوتاہیوں کو معاف فرمادے) اگرچہ وہ صوفیاء کے کٹر دشمن تھے اور ان کے خیال میں تصوف کل کا کل ضلالت ہے۔ اتنے شدید اختلافات کے باوجود مولانا کو تسلیم تھا کہ اسلام کے اصل فلسفی صوفیاء ہی تھے۔ جہاں تک تصوف کا فلسفیانہ پہلو ہے تو وہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے' البتہ تصوف کا عملی پہلو "تزکیۂ نفس" اکثر لوگوں کو معلوم ہے۔

میرے نزدیک تاریخ انسانیت کے سب سے بڑے ماہرین نفسیات صوفیاء کرام تھے۔ جس طرح انہوں نے نفس انسانی کی گہرائیوں میں اتر کر مشاہدہ کیا ہے کہ حقائق کیا ہیں؟ انسان کے اندر کیا کچھ موجزن ہے؟ انسان کے نفس کے اندر کیسے کیسے طوفان برپا ہیں؟ جدید مادہ پرست ماہرین نفسیات کی تو وہاں تک رسائی ہی نہیں۔

بے خدا فلسفہ

فلسفہ اور محض فلسفہ جس میں سارا دارومدار منطق پر ہوتا ہے اور منطق جو ہمارے حواس اور معلومات پر مبنی ہے اس کی منطقی انتہاء (Logical climax or end) ارتیابیت یا لاادریت ہے۔ لہٰذا اگر کسی نے دلیلوں کے ذریعے اللہ کو ماننا ہے تو قطعاً اس مقام تک نہیں پہنچ سکتا۔

علامہ اقبال مرحوم نے اپنے پہلے خطبے میں کہا تھا کہ وجودِ باری تعالیٰ کے لئے جتنے بھی دلائل (arguments) دیئے گئے ہیں وہ سب ایک دوسرے کو کاٹ دیتے ہیں۔ دلیل' دلیل کو کاٹ دیتی ہے۔ منطق' منطق سے کٹ جاتی ہے۔ چنانچہ منطق اور دلائل سے آپ اللہ تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس کے لئے کچھ اور کام کرنے پڑتے ہیں جن کے ذریعے انسان کو نعمت یقین حاصل ہوتی ہے۔

تصوف کا میدان

تصوف میں جو چیزیں زیر بحث آتی ہیں وہ سلوک ہے' تقرب الی اللہ کی منزلیں طے کرنا ہے' وصول الی اللہ کے لئے آگے بڑھنا ہے' جس میں کئی مقامات اور منزلیں آتی

ہیں : مقامِ صبر، مقامِ شکر، مقامِ محبت، مقامِ تسلیم و رضا اور مقامِ توکل و تفویض۔ بہرحال تصوف کا حاصل مرتبۂ ولایت ہے جس کو قرآن حکیم نے ﴿ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴾ اور ﴿ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ﴾ کہا ہے۔ یعنی بندہ اللہ سے راضی، اللہ بندے سے راضی، بندہ اللہ کا دوست اور اللہ بندے کا دوست ـــــ اور دوستی بھی ایسی مثالی جس کا نقشہ حدیث قدسی میں اس طرح بیان ہوا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا :

((اِنَّ اللّٰهَ قَالَ : مَنْ عَادٰى لِى وَلِيًّا فَقَدْ آذَنْتُهُ بِالْحَرْبِ ، وَمَا تَقَرَّبَ اِلَيَّ عَبْدِىْ بِشَىْءٍ اَحَبَّ اِلَيَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَيْهِ ، وَمَا يَزَالُ عَبْدِىْ يَتَقَرَّبُ اِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰى اُحِبَّهُ ، فَاِذَا اَحْبَبْتُهُ : كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِىْ يَسْمَعُ بِهٖ ، وَبَصَرَهُ الَّذِىْ يُبْصِرُ بِهٖ ، وَيَدَهُ الَّتِىْ يَبْطِشُ بِهَا ، وَرِجْلَهُ الَّتِىْ يَمْشِىْ بِهَا ، وَاِنْ سَاَلَنِىْ لَاُعْطِيَنَّهُ ، وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِىْ لَاُعِيذَنَّهُ ، وَمَا تَرَدَّدْتُ عَنْ شَىْءٍ اَنَا فَاعِلُهُ تَرَدُّدِىْ عَنْ نَفْسِ الْمُؤْمِنِ ، يَكْرَهُ الْمَوْتَ وَاَنَا اَكْرَهُ مَسَاءَتَهُ)) (۵)

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں : "جس نے میرے ولی (دوست) کے ساتھ دشمنی کی میں اس کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیتا ہوں۔ جو کام میں نے اپنے بندے پر فرض کر رکھے ہیں ان سے زیادہ کسی دوسرے ذریعے سے میرا بندہ میرا قرب حاصل نہیں کر سکتا۔ تاہم بندہ نوافل کے ذریعے مسلسل میرے قریب ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ اور جب میں اس کو اپنا محبوب بنا لیتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کی ٹانگ بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔ اگر وہ مجھ سے کچھ مانگتا ہے تو میں اسے ضرور دیتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے پناہ کا طالب ہو تو اسے پناہ دیتا ہوں۔ اور میں کسی کام میں بھی اتنے تردد سے کام نہیں لیتا جتنا تردد مجھے مؤمن کی جان نکالنے کے بارے میں ہوتا ہے۔ مؤمن کو موت ناپسند ہوتی ہے اور میں بھی اسے تکلیف دینا نہیں چاہتا"۔

یہ مرتبہ ولایت ہے، جس کے نتیجے میں انسان اسلام اور اس کے بعد ایمان کی منزلیں طے کر کے مرتبۂ احسان پر فائز ہو جاتا ہے۔ کیونکہ مرتبۂ ولایت ایمان میں گہرائی کا نتیجہ ہے۔ ایمان کی گہرائی، گیرائی، شدت اور قوت کی وجہ سے وہ انسان کا حال بن جاتا ہے۔ جب یہ کیفیت پیدا ہو گی تو بندے کی اطاعت، دلی کیفیت، فطرت، اللہ کے لئے فدائیت و فدویت آسمان کو چھونے لگے گی۔ گویا کہ وہ ﴿ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ﴾ کا عملی نمونہ پیش کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ایمان کی مثال درخت سے اس لئے دی ہے کہ درخت جس قدر اونچا ہوتا جاتا ہے اسی اعتبار سے اس کی جڑ زمین میں گہری اور مستحکم ہوتی جاتی ہے۔ یہ مقابلے میں دو طرفہ عمل ہے۔ جس قدر جڑ نیچے گہری ہو گی اسی اعتبار سے برگ و بار اوپر نظر آئیں گے اور جس قدر درخت کا ظاہری پھیلاؤ زیادہ ہو گا اسی اعتبار سے اس کی جڑ زمین میں گہری ہو گی۔ اگر ایمان جڑ کا حکم رکھتا ہے تو برگ و بار اور شاخیں نیک اعمال کا مقام رکھتی ہیں۔ اس اعتبار سے مرتبۂ ولایت اور احسان میں کوئی فرق نہیں، لیکن پوشیدہ جڑ اور ظاہری شاخوں اور پتوں کا اپنا علیحدہ علیحدہ مقام ہے۔

تقدیر پر ایمان

اللہ تعالیٰ پر ایمان کا لازمی خاصہ تقدیر پر ایمان ہے۔ انسان تسلیم و رضا کا خوگر بن جائے، یعنی راضی برضائے رب رہے۔ وہ اس بات پر یقین کر لے کہ جو کچھ بھی ہوتا ہے، چاہے اس میں مادی اسباب و علل کتنے ہی کیوں نہ ہوں، لیکن مسبّب الاسباب اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ جو کچھ ہو رہا ہے وہ باذنِ ربی ہو رہا ہے، لہٰذا جو کچھ میرے رب کی طرف سے آئے اس پر کیا شکوہ و شکایت؟ کیا رنج؟ کیا غم؟ یقیناً اسی میں میری خیر ہے۔ میں تو کوتاہ نظر ہوں، میں تو اتنا بھی نہیں جانتا کہ میری بھلائی کس میں ہے۔ اسی لئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾ (البقرۃ : ۲۱۶)

"ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں ناگوار ہو اور وہی تمہارے لئے بہتر ہو اور ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند ہو اور وہی تمہارے لئے بری ہو۔ اللہ جانتا ہے اور تم

نہیں جانتے۔"

تو معلوم ہوا کہ راضی برضائے رب رہنا در حقیقت تسلیم و رضا کا نام ہے۔ ؎

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی!

اسی کا منطقی نتیجہ یا تصویر کا دوسرا رخ "توکل اور تفویض" ہے۔

رضا و توکل میں فرق

رضا کا تعلق اُس نتیجے پر ہے جو ہم پر وارد ہو رہا ہے' یعنی جو بھی حالات آ رہے ہیں۔

﴿ مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ (التغابن : ۱۱)

"کوئی مصیبت کبھی نہیں آتی مگر اللہ کے اذن سے ہی آتی ہے"۔

اس کے بالمقابل جو اعمال' بھاگ دوڑ' سعی' جدوجہد اور تگ و دو ہم سے صادر ہو رہے ہیں ان کے نتائج پر اطمینان توکل کہلاتا ہے۔ سارے اسباب و وسائل موجود ہوں لیکن جب تک اللہ نہ چاہے کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ مثلاً آپ کو کل کہیں جانا ہے' گاڑی اے ون حالت میں ہے' پٹرول وغیرہ بھی ٹھیک ہے' اگر آپ نے کہہ دیا کہ میں کل ضرور وہاں جاؤں گا تو آپ اللہ کو بھول گئے۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت و اِذن درمیان میں یاد نہیں رہا۔

معرفتِ رب کے مقامات

امام رازیؒ نے معرفتِ رب کے تین مقام بیان کئے ہیں :

① معرفتِ رب کا بلند مقام تو یہ ہے کہ ہر شے سے پہلے اللہ نظر آئے۔

② درمیانی مقام یہ ہے کہ ہر شے کے ساتھ اللہ نظر آئے۔

③ اس کا ادنیٰ مقام یہ ہے کہ واقعے کے بعد اللہ یاد آ جائے۔

ذرا غور کریں کہ ہمیں تو نہ اللہ نظر آتا ہے نہ یاد آتا ہے' بس ظاہری عوامل پر غور کیا جاتا ہے۔ لہٰذا واقعات و حادثات کے نتیجے میں ایمان بیدار ہوتا ہے نہ توکل پیدا ہوتا ہے۔

توکل کا صحیح مفہوم

عام طور پر توکل کے یہ معنی لئے جاتے ہیں کہ ہاتھ پاؤں چھوڑ کر بیٹھ جاؤ۔ یہ توکل

نہیں ہے۔ بلکہ پوری طرح محنت کرنا ضروری ہے' جیسا کہ قرآن حکیم دشمن کے خلاف وسائل حرب تیار رکھنے کا حکم دیتا ہے۔ فرمایا :

﴿ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ . . . ﴾

(الانفال : ٦٠)

"اور تم لوگ جہاں تک تمہارا بس چلے زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلے کے لئے تیار رکھو۔"

کسی شاعر نے اس شعر میں توکل کا سارا مفہوم و مدعا بیان کر دیا ہے ؎

توکل کا یہ مطلب ہے کہ خنجر تیز رکھ اپنا
نتیجہ اس کی تیزی کا مقدر کے حوالے کر

مگر تمام اسباب و ذرائع کے ہوتے ہوئے کبھی یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ ان وسائل کی وجہ سے نتیجہ برآمد ہو جائے گا' بلکہ وہی ہو گا جو اللہ چاہے گا' "مَاشَآءَ اللّٰهُ كَانَ مَالَمْ يَشَالَمْ يَكُنْ" یعنی جو اللہ تعالیٰ نے چاہا وہ ہو گیا اور جو نہ چاہا وہ نہیں ہو سکا۔ مثلاً آپ نے کسی کام کے لئے بڑی محنت و کوشش کی' عرصہ دراز تک تگ و دو کرتے رہے مگر وہ نہ ہو پایا اور کسی وجہ سے موقع ہاتھ سے نکل گیا تو جس آدمی کے دل میں توکل نہ ہو گا اس کا حال یہ ہو گا کہ رنج و غم اور صدمہ لئے بیٹھا ہے کہ اتنی محنت کی' پیسہ خرچ کیا' سفارشیں لڑوائیں' لوگوں کی خوشامد کر کے اپنی عزت کو برباد کیا' سب کچھ کر کے دیکھ لیا مگر کام نہیں بنا۔ لیکن اگر ایمان بالقدر موجود ہو اور بالخصوص توکل دل میں سمایا ہوا ہو تو ایسی صورت میں نہ کوئی پریشانی ہو گی اور نہ خلافِ توقع نتائج پر رنج و الم ہو گا۔ ایک حدیث سے اس ضمن میں واضح راہنمائی ملتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ :

كُنْتُ خَلْفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ يَوْمًا ' فَقَالَ لِي : ((يَا غُلَامُ ' اِنِّي اُعَلِّمُكَ كَلِمَاتٍ ' اِحْفَظِ اللّٰهَ يَحْفَظْكَ ' اِحْفَظِ اللّٰهَ تَجِدْهُ تُجَاهَكَ ' اِذَا سَاَلْتَ فَاسْاَلِ اللّٰهَ ' وَاِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ ' وَاعْلَمْ اَنَّ الْاُمَّةَ لَوِ اجْتَمَعَتْ عَلٰى اَنْ يَّنْفَعُوْكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَنْفَعُوْكَ اِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللّٰهُ لَكَ ' وَاِنِ اجْتَمَعُوْا عَلٰى اَنْ يَّضُرُّوْكَ بِشَيْءٍ ' لَمْ يَضُرُّوْكَ اِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللّٰهُ عَلَيْكَ ' رُفِعَتِ الْاَقْلَامُ وَجَفَّتِ الصُّحُفُ)) (٦)

میں ایک روز رسول اللہ ﷺ کے پیچھے سوار تھا۔ آپؐ نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا : "اے نوجوان! میں تمہیں کچھ باتیں سکھانا چاہتا ہوں' اللہ کو یاد رکھو اللہ تمہاری حفاظت فرمائے گا' اللہ کو یاد رکھو تم اسے اپنے سامنے پاؤ گے' جب مانگو تو اللہ سے مانگو' جب مدد طلب کرو تو اللہ سے مدد طلب کرو' اور یہ بات اچھی طرح جان لو کہ اگر تمام لوگ مل کر تمہیں کوئی نفع دینا چاہیں تو صرف اتنا ہی نفع دے پائیں گے جو اللہ نے تمہارے لئے لکھ دیا ہے اور اگر سارے انسان مل کر تمہیں کچھ نقصان پہنچانا چاہیں تو صرف اتنا ہی نقصان دے سکیں گے جتنا اللہ نے تمہارے لئے لکھ دیا ہے۔ قلم اٹھائے جا چکے ہیں اور رجسٹر خشک ہو چکے ہیں"

اسی حدیث میں آیا ہے کہ :

((وَاعْلَمْ اَنَّ مَا اَصَابَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُخْطِئَكَ وَاَنَّ مَا اَخْطَاكَ لَمْ يَكُنْ لِيُصِيْبَكَ)) (۷)

"اور یہ بات اچھی طرح جان لو کہ جو چیز تمہیں مل چکی ہے وہ کبھی تم سے خطا نہیں ہو سکتی تھی اور جو تمہیں نہیں ملی ہے وہ کبھی تمہیں مل نہیں سکتی تھی"۔

انسان کو مایوسی اور frustration سے بچانے والی شے تسلیم و رضا کی خو ہے۔ سارے نفسیاتی امراض جنہیں ہم دماغی امراض بھی کہتے ہیں frustration کا نتیجہ ہیں اور ان سب کا ازالہ یقین محکم اور ایمان بالقدر کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ حدیث میں تو یہاں تک آیا ہے کہ :

((اَنَّ كَلِمَه لَو تَفْتَحُ عَمَلَ الشَّيْطَانِ))

"لفظ "لَوْ" (اگر) سے شیطان کا کام شروع ہو جاتا ہے۔"

یعنی یہ کہنا کہ اگر میں یوں کرتا تو یہ ہو جاتا اور اگر اس طرح کرتا تو یہ نتیجہ نکل آتا' اس سے شیطان کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ ذرا غور کریں کہ تمہاری مرضی کے مطابق نتیجہ کیسے نکل آتا؟ جو اللہ کا فیصلہ تھا وہی نتیجہ نکلنا تھا' لہٰذا تمہاری یہ سوچ ایمان کے منافی ہے۔

اس مقام پر پہنچ کر ذرا غور کریں کہ اگر انسان پر ایمان کے حقائق منکشف ہو جائیں' اس کے دل میں راسخ ہو جائیں' بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اس کا حال بن جائیں تو اس کے بعد کیسا رنج اور کیسا خوف؟ خوف اسی وقت ہوتا ہے جب غیر مطلوبہ نتائج کا خطرہ ہو' لیکن

جب یقین ہو جائے کہ جو اللہ چاہے گا وہی ہو گا' کسی کے ہاتھ میں نہ میری برائی ہے اور نہ اچھائی ہے تو پھر انسان کیونکر کسی کے سامنے ذلیل ہو گا؟ کیونکر کسی کی خوشامد کرے گا؟

اب تسلیم و رضا اور تفویض و توکل کو ایک جگہ جمع کرلیں تو نتیجہ نکلے گا "ایمان بالقدر" ـــــ جو ہمارے ایمانیات کا اہم اور لازمی جزو ہے۔ حدیث جبریل میں آیا ہے :

((اَنْ تُؤْمِنَ بالقَدْرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ)) "اور یہ کہ تم اچھی اور بُری تقدیر پر ایمان لاؤ"۔

ایک مغالطہ اور اس کی وضاحت

مغالطہ : تقدیر کے ضمن میں آج کل ایک خاص قسم کا عقلیت پسندانہ (rationalistic) اندازِ فکر اختیار کیا جاتا ہے کہ تقدیر کے موضوع کو بند ہی رکھو' یہ ذرا مشکل موضوع ہے اور یہ ایک معمہ ہے۔ کیونکہ جونہی تقدیر کا لفظ ہمارے سامنے آتا ہے جبریت (predeterminism) کا تصور آجاتا ہے اور اگر جبریت کو صحیح مان لیا جائے تو پھر حساب کیسا؟ جزا و سزا کس چیز کی؟ اگر کوئی نیکی یا بدی مجبوراً کر رہا ہے تو بدلہ کیوں؟

وضاحت : دراصل ایمان بالقدر اللہ تعالیٰ کی دو صفات پر پختہ ایمان و یقین کا لازمی نتیجہ ہے :

(۱) اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ یعنی اس کی قدرت ہر چیز پر غالب ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ کا علم تمام اشیاء کا احاطہ کئے ہوئے ہے کہ ماضی و مستقبل کا کوئی کام اس کے علم سے باہر نہیں۔

اس ضمن میں درج ذیل آیات پر ایک نگاہ ڈال لیں :

(۱) ﴿ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴾ (۹)

"اللہ تعالیٰ ہر چیز پر کامل قدرت رکھنے والا ہے"

(۲) ﴿ اَلَآ اِنَّہٗ بِکُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ ﴾ (فصلت : ۵۴)

"آگاہ رہو اس کی ذات ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے"

(۳) ﴿ وَکَانَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطًا ﴾ (النساء : ۱۲۶)

"اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے"

(۴) ﴿ وَاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا ﴾ (الطلاق : ۱۲)

"اللہ تعالیٰ نے علم کے اعتبار سے ہر چیز کا احاطہ کیا ہوا ہے"

(۵) ﴿ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا یَعْمَلُوْنَ مُحِیْطٌ ﴾ (آل عمران : ۱۲۰)

"جو کچھ یہ کر رہے ہیں یقیناً اللہ نے اس کا بھی احاطہ کیا ہوا ہے"

احاطۂ قدرت اور احاطۂ علم کو سمجھ لینے سے تقدیر کا عقدہ حل ہو جاتا ہے۔ واضح رہے کہ پیشگی علم (fore-knowledge)' جبریت (predetermination) کو مستلزم نہیں ہے۔ اگر کسی چیز کا آپ کو علم ہو گیا تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ اگر وہ شے ہو رہی ہے تو آپ کے جبر کی وجہ سے ہو رہی ہے۔ ان دونوں کو علیحدہ کر لیں تو بات سمجھ میں آ جائے گی۔

سادہ ترین مثال ہے کہ آپ کسی بچے کے سامنے خوشنما اور خوبصورت کھلونا رکھ کر اندازہ کر سکتے ہیں کہ بچہ لامحالہ اس کی طرف متوجہ ہو گا اور آپ کا اندازہ صحیح ثابت ہو گیا۔ لیکن کیا بچے نے آپ کے جبر کے تحت اس کھلونے کی طرف توجہ کی؟ یا صرف آپ کا اندازہ تھا جو عملاً صحیح ثابت ہوا؟ اور ہمارا اندازہ صحیح بھی ثابت ہو سکتا ہے اور غلط بھی' لیکن اللہ کا علم کبھی غلط نہیں ہو سکتا' کیونکہ اس کا علم ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ کون کس وقت کیا کرے گا یہ اللہ کو پیشگی معلوم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو کفر و ایمان دونوں کے اختیار میں آزادی دے رکھی ہے۔ فرمایا :

﴿ فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَكْفُرْ ﴾ (الکھف : ۲۹)

"اب جس کا جی چاہے مان لے اور جس کا جی چاہے انکار کر دے۔"

معلوم ہوا کہ انسانوں کو اختیار تو ہے البتہ اللہ تعالیٰ کو بخوبی علم ہے اور اللہ کا علم غلط نہیں ہو سکتا۔ اور ہو گا وہی جو اللہ کے علم میں ہے اگر آپ fore-knowledge کو predetermination سے علیحدہ کر دیں تو مسئلہ حل ہو جائے گا۔ لیکن یہ جان لیجئے کہ بہرحال تقدیر پر ایمان' ایمانیاتِ اسلام کا لازمی جزو اس لئے کسی بھی جدید فکر یا رجحان کی وجہ سے آنکھیں بند کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔

توکل و تفویض اور اس کے نفسیاتی ثمرات

ہر مسلم و مؤمن کا ایمان اس کیفیت کا ہونا چاہیے کہ محنت ضرور کرے لیکن نتائج کے

بارے میں کہے :

﴿ وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ بَصِیْرٌ بِالْعِبَادِ ○ ﴾

(المومن : ۴۴)

"میں اپنا معاملہ میں اللہ کے سپرد کرتا ہوں' یقیناوہ اپنے بندوں کا نگہبان ہے۔"

اور اللہ کا جو فیصلہ ہو گا میں اس پر راضی ہوں۔ ٹھیک ہے میں محنت کر رہا ہوں' اپنے فرائض ادا کر رہا ہوں' بھاگ دوڑ کر رہا ہوں۔ جو کچھ آپ کر سکتے ہیں وہ تو آپ کو کرنا ہی پڑے گا' لیکن اس کے بعد نتائج کے بارے میں توکل اللہ کی ذات پر ہو نہ کہ وسائل و اسباب پر۔ چنانچہ فرمایا :

﴿ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِیْ وَکِیْلًا ○ ﴾ (بنی اسرائیل : ۲)

"کہ میرے سوا کسی کو اپنا وکیل (کارساز) نہ بنانا"۔

تفویض میں اس قدر سکون و اطمینان ہے کہ نہ کوئی تشویش نہ کوئی چنتا۔ معاملہ اللہ کے سپرد کیا اور مطمئن ہو گئے۔ کسی فارسی شاعر نے اس مفہوم کو بہت خوبصورتی کے ساتھ ایک شعر میں سمو دیا ہے۔

کار سازِ ما بہ فکر کارِ ما
فکر ما در کارِ ما آزارِ ما

اس شعر کی تہہ تک پہنچنے کے لئے اس حدیث پر غور کر لیں تو بات بن جائے گی۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

((مَنْ کَانَ فِیْ حَاجَةِ اَخِیْهِ کَانَ اللّٰهُ فِیْ حَاجَتِهٖ)) (۱۰)

"جو کوئی اپنے مسلمان بھائی کی ضرورت پوری کر رہا ہو تو اللہ اُس شخص کی ضرورت پوری کرنے میں لگ جاتا ہے۔"

یہ تو انسانوں کا آپس میں معاملہ ہوا۔ اگر آپ اللہ کے کام میں لگ جائیں تو کیا اللہ بے مروت ہے؟ کیا خیال ہے اگر آپ اللہ کے کام میں لگ جائیں تو وہ آپ کے کاموں کو درست نہ کرے گا؟ چنانچہ نصرتِ خداوندی کے حصول کا لازمی ذریعہ کون سا ہے؟ فرمایا :

﴿ اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ ... ﴾ (محمد : ۷)

"اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا۔"

تم اللہ کے دین کی نصرت میں لگ جاؤ' اس کا جھنڈا اُٹھاؤ' وہ لازماً آپ کا بھلا ہی چاہے گا۔ اس کے بعد اگر میں واقعتاً اللہ کا بندہ بن جاؤں' اس کے لئے اپنے آپ کو کھپا دوں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے میرے سارے کام سیدھے نہ کر دے گا۔ جب میرا کارساز ہی میری فکر میں ہے تو پھر پریشانی کیسی' اور چنتا کس چیز کی؟ اور اگر میں اپنے کام خود کروں گا تو لازماً کچھ نہ کچھ بگاڑ بیٹھوں گا۔ میرا علم کامل نہیں لہٰذا میں ٹھوکر کھاؤں گا اور نتیجتاً "فکر ما در کارِ ما آزارِ ما" بن جائے گا۔ لہٰذا سارے کام اللہ کے سپرد کر کے پرسکون ہونا ہی خیریت کا موجب ہے۔ اسی لئے فرمایا :

﴿ وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ بَصِیْرٌ بِالْعِبَادِ ○ ﴾

(المومن : ۴۴)

قرآن حکیم کے ذریعے علاج غم و حزن

ہمارا مقام ہے عبدیت اور عبدیت کی شدت و گہرائی ہے مرتبہ ولایت' جس کے بارے میں اللہ کا فرمان ہے :

﴿ اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ○ ﴾

(یونس : ۶۲)

"جو اللہ کے دوست ہیں ان کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔"

اولیاء اللہ کوئی خارجی مخلوق نہیں بلکہ انسانوں میں سے ہیں۔ ان کے ایمان کی گہرائی بہت اتھاہ ہوتی ہے' لہٰذا نتیجہ نکلتا ہے :

﴿ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ ○ لَهُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ ﴾ (یونس : ۶۳'۶۴)

"جو ایمان لائے اور جنہوں نے تقویٰ کا رویہ اختیار کیا دنیا و آخرت دونوں زندگیوں میں ان کے لئے بشارتیں ہی بشارتیں ہیں۔"

لہٰذا ان کے لئے دنیا و آخرت میں بشارتیں ہی بشارتیں ہیں' ان کے لئے کسی رنج و غم اور افسوس کا سوال ہی نہیں' بلکہ ﴿ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ﴾ اور ﴿ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ﴾ کے مقام پر فائز ہیں۔

ایک دعا پر غور کریں جس میں مقام عبدیت' سپردگی' تفویض' راضی برضاء رب ہونے کی کیفیت اور قرآن کے ذریعے اپنے رنج و غم کے ازالے کی درخواست یکجا جمع ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا : جس کسی کو کبھی بھی کوئی تکلیف ہو تو وہ اگر یہ دعا پڑھے تو اللہ تعالیٰ اس کے غم کا ازالہ کرکے اس کی جگہ خوشی بھر دیتا ہے۔ دعا یوں ہے :

((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ عَبْدُكَ' وَابْنُ عَبْدِكَ' وَابْنُ اَمَتِكَ' نَاصِیَتِیْ بِیَدِكَ' مَاضٍ فِیَّ حُكْمُكَ' عَدْلٌ فِیَّ قَضَآؤُكَ' اَسْاَلُكَ بِكُلِّ اسْمٍ ھُوَ لَكَ' سَمَّیْتَ بِهٖ نَفْسَكَ' اَوْ اَنْزَلْتَهٗ فِیْ كِتَابِكَ' اَوْ عَلَّمْتَهٗ اَحَدًا مِّنْ خَلْقِكَ اَوِ اسْتَاْثَرْتَ بِهٖ فِیْ عِلْمِ الْغَیْبِ عِنْدَكَ ' اَنْ تَجْعَلَ الْقُرْاٰنَ رَبِیْعَ قَلْبِیْ وَنُوْرَ صَدْرِیْ وَجَلَاءَ حُزْنِیْ' وَذَھَابَ ھَمِّیْ)) (۱۱)

"اے اللہ میں تیرا بندہ ہوں' میرا باپ بھی تیرا ادنیٰ غلام تھا' میری ماں بھی تیری کنیز تھی' میری پیشانی تیرے ہاتھ میں ہے۔ میرے وجود پر تیرا ہی حکم جاری و ساری ہے۔ میرے بارے میں آپ کا جو فیصلہ ہو وہ انصاف ہی انصاف ہے۔ ہر اس اسم مبارک کے واسطے سے جو تیرا ہے' جس سے تو نے اپنے آپ کو خود موسوم کیا یا اسے اپنی کتاب میں نازل فرمایا یا اپنی مخلوق میں سے کسی کو تو نے وہ نام سکھایا یا خزانہ غیب میں اپنے پاس محفوظ فرمایا' ان سب ناموں کا واسطہ دے کر میں درخواست کرتا ہوں کہ قرآن حکیم کو میرے دل کی بہار بنا دے' میرے سینے کا نور بنا دے اور میری پریشانی کو دور کرنے والا نسخہ بنا دے اور میرے غم و تفکر کے ازالے کا ذریعہ بنا دے"۔

عظمت قرآن پر اس سے بڑی کوئی شے نہیں ہو سکتی۔ قرآن کا مقام بتمام و کمال اللہ جانتا ہے' پھر محمد رسول اللہ ﷺ جانتے ہیں ع

"قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند گوہری!"

شعوری وغیر شعوری ایمان

شعوری ایمان :

شعوری ایمان وہ ہے جس کے ساتھ intellectual element موجود ہو' یعنی ذہنی و فکری صلاحیتوں کا اتحاد ہو۔

ایمان و یقین کا محل و مقام تو قلب ہے اور سوچ بچار کا مرکز دماغ ہوتا ہے۔ جب دل و دماغ کی سوچ ایک ہو تو وہ شعوری ایمان ہوتا ہے۔ اسی کیفیت کو قرآن حکیم نے "علیٰ وجہ البصیرۃ" کا نام دیا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی زبانی اعلان کروایا گیا :

﴿ قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ﴾

(یوسف : ۱۰۸)

"تم ان سے صاف کہہ دو کہ میرا راستہ تو یہ ہے' میں اللہ کی طرف بلا رہا ہوں' علیٰ وجہ البصیرۃ میں اور میری پیروی کرنے والے"۔

گویا نہ میں خود ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہوں اور نہ فلسفیوں کی طرح ظن و تخمین کے تیر چلا رہا ہوں اور نہ ہی میرا ساتھ دینے والے اندھیرے میں تیر چلا رہے ہیں بلکہ ہم سب ایک واضح اور روشن راستے پر چل رہے ہیں اور ہم سب کا دل و دماغ پوری طرح مطمئن اور یکسو ہے۔

غیر شعوری ایمان :

غیر شعوری ایمان سے مراد یہ ہے کہ حقائق پر یقین تو ہے لیکن اس کے ساتھ کوئی intellectual element نہیں۔ یا تو انسان کا مزاج ہی intellectual نہیں ہے' اس کی استعداد ہی نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو اس نے معاملے کو علیحدہ علیحدہ رکھا ہوا ہے۔ مثلاً اگر دل مطمئن ہے تو اس پر دماغ ساتھ نہیں دے پا رہا یا دماغ بات کو پا رہا ہے تو اس پر دل نہیں ٹھک رہا۔

دل و دماغ کی علیحدہ کیفیت کو ایک مثال سے سمجھ لیں۔ میں نے ایک مرتبہ ڈاکٹر کمال الدین عثمانی صاحب (ایم ایس سی بائنی) سے دریافت کیا کہ ڈارون کے نظریئے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ انہوں نے کہا کہ ڈارون کے فلسفے کے دلائل تو بڑے متاثر کرنے

والے(convincing)ہیں۔دماغ اس پر convinced ہے لیکن دل کہتا ہے کہ کفر ہے۔ چنانچہ شعوری ایمان وہ ہے جس میں دل و دماغ دونوں متحد ہوں اور حقیقت میں یہی ایمان مطلوب ہے۔

اہم حقائق

(۱) اصل چیز یقین ہے' چاہے وہ شعوری (دلائل و شواہد کی بنیاد پر) ہو یا غیر شعوری ہو۔ مثلاً ایک شخص کو شدید پیاس لگی ہے اور فرض کر لیجئے کہ اس نے کبھی پانی نہیں پیا اور نہ اسے پانی کا پتہ ہے۔ اب اس کی جان پر جو بیت رہی ہے اس کا تو اسے علم ہے۔ اس کیفیت میں کوئی اسے پانی کا گلاس دے دیتا ہے تو اس کو پی کر اسے یقین کامل ہو جاتا ہے کہ مجھے اسی چیز کی ضرورت تھی اور میرے اندر جو قیامت برپا تھی اس کا علاج یہی تھا' کیونکہ اس نے میری پیاس بجھا دی ہے۔ اس کو یقین تو حاصل ہو گیا لیکن دلائل و شواہد کی بنیاد پر نہیں بلکہ تجربے کی بنیاد پر۔ البتہ اسے یہ معلوم نہیں کہ پانی کی کمی سے انسان کے جسم میں کیا فتور آتا ہے اور کس کس عضو پر کیا کیا قیامت بیت جاتی ہے۔

اس کے بالمقابل ایک ڈاکٹر کو معلوم ہے کہ پانی انسانی زندگی کے لئے کیوں ضروری ہے' اس کی کمی سے کیا کیا نقصانات ہو سکتے ہیں' کس کس عضو میں کیا خرابی پیدا ہو گی' کیونکہ ڈاکٹر intellectual element رکھتا ہے' اس کا علم علیٰ وجہ البصیرۃ ہے۔ تو معلوم ہوا کہ عام آدمی کو تجربے سے یقین حاصل ہوا کہ پانی پیاس بجھاتا ہے اور ڈاکٹر کو علم حقائق کے ذریعہ معلوم ہوا کہ پانی پیاس بجھاتا ہے چنانچہ دونوں کا یقین ایک ہی ہے کہ "پانی پیاس بجھاتا ہے"۔

(۲) آخرت میں نجات کی اصل بنیاد قلبی یقین ہے اور یہی قلبی یقین انسانی کردار پر اثر انداز ہوتا ہے' چاہے یہ قلبی یقین شعوری (intellectual) ہو یا غیر شعوری (non intellectual)۔ اس اعتبار سے یہ دونوں یقین بالکل برابر ہیں' چاہے آپ اس کے دلائل جانتے ہیں یا نہیں جانتے۔ فلسفہ معلوم ہو یا نہیں' کوئی فرق نہیں پڑے گا' یقین ہونا چاہئے اور بس۔

غالباً امام رازی کا یہ قول ہے : اَمُوْتُ عَلٰی عَقِیْدَۃِ عَجَائِزِ نَیْشَابُوْر "میں نیشاپور کی بوڑھی عورتوں کے عقیدے پر جان دے رہا ہوں" ـــــ چنانچہ اصل مطلوب یقین

ہے چاہے وہ شعوری ہو یا غیر شعوری' اور یقین بہرحال انسانی کردار پر اثر انداز ہوتا ہے۔

نوٹ : یہ صحیح ہے کہ شعوری اور غیر شعوری ایمان دنیا میں اصلاح کردار اور آخرت میں نجات کے لئے یکساں ہیں' لیکن ذہین لوگوں کی مجبوری ہے کہ ان کے سامنے علیٰ وجہ البصیرۃ والا ایمان پیش کیا جائے جو وہ قبول کر سکیں۔ یہ دورِ حاضر کی ناگزیر ضرورت ہے۔ کیونکہ ذہین لوگ اپنی ذہنی اور طبعی ساخت کے ہاتھوں مجبور ہیں کہ پہلے کوئی بات ان کے ذہن و شعور کو اپیل کرے گی تو وہ دل تک جائے گی' تب وہ مانیں گے' ورنہ ان کے دلوں پر غلاف پڑے رہیں گے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کام دور حاضر کی ضرورت کیوں ہے؟ اس کے دو اسباب ہیں:

پہلا سبب : دور حاضر میں سائنسی معلومات (Scientific Information) کا اتنا بڑا ظہور (explosion) ہوا ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ اب ظاہر بات ہے کہ عوام بھی بند گلیوں میں تو نہیں رہتے' اسی فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ لہٰذا ان کی معلومات میں بے انتہا اضافہ ہوا ہے۔

دوسرا سبب : سمعی و بصری ذرائع ابلاغ نے جدید فلسفوں کو grass root level تک پہنچا دیا ہے۔ اب تو ایک ریڑھی بان یا ہل چلانے والا بھی استحصال جیسا ثقیل لفظ استعمال کرتا ہے۔ پہلے صرف الیکٹرک ریڈیو تھا' جہاں تک بجلی تھی وہیں تک کام کرتا تھا' ٹرانزسٹر آگیا' چنانچہ ایک کمہار بھی گدھے پر جا رہا ہے تو ٹرانزسٹر ساتھ بج رہا ہے' گاؤں میں ایک آدمی ہل چلا رہا ہے اور ٹرانزسٹر ساتھ لٹکا ہوا ہے۔ اس کے بعد ٹیلی ویژن ہر گاؤں میں پہنچ چکا ہے۔ لوگ چاہے ڈرامے دیکھیں یا گانے سنیں فکر تو بہرحال منتقل ہو رہی ہے۔

ان دو اسباب کے بعد اب آپ صرف عوام الناس کو بھی اس وقت تک قائل نہیں کر سکیں گے جب تک ذہین طبقے (Intellectual) کی فکر پر اثر انداز نہیں ہوں گے۔ چنانچہ آج کے دور میں اس کی اشد ضرورت ہے۔ علامہ اقبال کا شعر ہے ؎

عذابِ دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیل!

واقعتاً آگ کی حدت کا صحیح ادراک اسے ہی ہو سکتا ہے جو آگ میں ڈالا جائے۔ جدید فلسفوں کا مطالعہ کرنے والوں کو ہی خبر ہے کہ برٹنڈرسل اس دنیا میں کیا کچھ کر گیا ہے' کتنے کروڑ افراد اس کے فلسفۂ حیات سے متاثر ہوئے ہیں۔ ہمارے قدیم علماء کو کیا پتہ؟ انہوں نے تو فلسفہ پڑھا ہی نہیں۔ اگر پڑھتے بھی ہیں تو ارسطو کی منطق پڑھتے ہیں۔ حالانکہ جب تک اس دانش حاضر کا توڑ نہیں ہو گا ایمان کی کوئی تحریک عوامی سطح پر بھی بار آور نہیں ہو گی۔

معرفتِ رب

ایمان مجمل : "اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ کَمَا ھُوَ بِاَسْمَائِہٖ وَ صِفَاتِہٖ وَ قَبِلْتُ جَمِیْعَ اَحْکَامِہٖ اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَ تَصْدِیْقٌ بِالْقَلْبِ" ایمان مجمل کی معراج ہے معرفتِ رب' اور بلاشبہ اس عالی مقام پر محمد رسول اللہ ﷺ فائز ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ تعلّی کی بجائے کسر نفسی سے کام لے کر کہیں ((مَا عَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ وَ مَا عَبَدْنَاكَ حَقَّ عِبَادَتِكَ))[۱۲] "اے اللہ ہم تجھے نہ پہچان پائے جیسا کہ تجھے پہچاننے کا حق تھا اور نہ تیری عبادت کر پائے جیسا کہ تیری عبادت ہونی چاہئے تھی" کسر نفسی کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک آدمی کوہ ہمالیہ پر بیٹھا ہے' ہمیں تو یہی نظر آ رہا ہے کہ اس سے اونچی بلندی کوئی نہیں' لیکن اسے معلوم کہ میرے اوپر اونچا آسمان بھی موجود ہے ؎

تو جس کو سمجھتا ہے فلک اپنے جہاں کا
شاید وہ زمیں ہو کسی اور جہاں کی!

دوسری وجہ یہ بھی ممکن ہے کہ آپؐ نے یہ جملے جمع کے صیغے کے ساتھ اس لئے بیان کئے ہوں کہ امت کی طرف سے ترجمانی ہو جائے۔ اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :

﴿ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ﴾ : (الانعام : ۹۱' الحج : ۷۴' الزمر : ۶۷)

"اور انہوں نے اللہ کے مقام کو نہیں پہچانا جس قدر اس کے مقام کو پہچاننے کا حق تھا۔"

دراصل روحِ انسانی میں معرفتِ رب بتمام و کمال موجود ہے اور یہی تصوف کا میدان ہے۔ اور اس روح کا تعلق باری تعالیٰ سے ہے۔ ؎

اتصالِ بے تکیُّف بے قیاس
ہست رب الناس را با جانِ ناس

روحِ انسانی کا تعلق و اتصال ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ ہے' لیکن ہم اس اتصال کو کسی شے پر قیاس نہیں کر سکتے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات ـــــ لا مثل لہ ـــــ لا مثالہ ـــــ لا مثیل لہ اور "لیس کمثلہ شیء" ہے۔

بے تکیف اور بے قیاس ہونے کے باوجود بہرحال اتصال موجود ہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے) اپنے حواشی میں بہت پیارا شعر نقل کیا ہے ؎

جاں نہاں در جسم او ' در جاں نہاں
اے نہاں اندر نہاں اے جانِ جاں!

ہماری جان کا تعلق روح سے ہے اور روح کا تعلق باری تعالیٰ سے ہے۔ جان انسان کے اندر ہے اور کسی نے نہیں دیکھی' بلکہ یہ بھی معلوم نہیں کہ کہاں ہے' اس کا کیا رنگ ہے' اور اس کا کتنا وزن ہے؟ دو من کی لاش میں کتنے اونس جان کا وزن ہے؟ روسی سائنس دانوں نے بڑے حساس ترازو تیار کئے اور مرنے والے مریض کو اس کے اوپر رکھ دیا۔ جان نکلنے سے عین پہلے اور بعد کا وزن کرنے کے بعد انہوں نے دعویٰ کیا کہ جان کا وزن چند اونس ہوتا ہے۔ حالانکہ مرنے کے بعد جسم کے وزن میں کمی کی کئی دوسری وجوہات بھی ہو سکتی ہیں۔

بہرحال معرفتِ رب بلکہ محبت رب روحِ انسانی کے اندر ودیعت شدہ ہے۔ یہ بات ابتدا میں گزر چکی ہے کہ آخر انسان کیوں جوابدہ ہے؟ چاہے کوئی نبی آتا یا نہ آتا ـــــ اس لئے کہ انسان کو مندرجہ ذیل صلاحیتیں دی گئی ہیں۔

(۱) سمع و بصر (۲) فواد و عقل (۳) نیکی اور بدی کی فطری تمیز (۴) روح میں اللہ کی معرفت اور محبت ـــــ اور اسی کا نام نور فطرت ہے۔

ایمان اور فطرتِ انسانی

ہم اپنی بول چال میں دو لفظ استعمال کرتے ہیں : (۱) جبلت و طبیعت (۲) فطرت جبلت و طبیعت کا تعلق حیوانی تقاضوں (animal Instincts) سے ہوتا ہے' جبکہ فطرت کا تعلق روح کے ساتھ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

﴿ فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا ﴾ (الروم : ۳۰)

"اللہ کی بنائی ہوئی وہ فطرت جس پر اللہ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔"

چنانچہ نسل آدم کا ہر بچہ فطرت پر ہی پیدا ہوتا ہے اور اس کے دل میں معرفتِ رب موجود ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ جب وہ غیر اسلامی ماحول میں پرورش پاتا ہے تو اس کی یہ فطرت مسخ ہو جاتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

((مَا مِنْ مَوْلُوْدٍ اِلاَّ یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَةِ ' فَاَبَوَاهُ یُهَوِّدَانِهٖ اَوْ یُنَصِّرَانِهٖ اَوْ یُمَجِّسَانِهٖ)) (۱۳)

"ہر بچہ فطرت سلیمہ پر پیدا ہوتا ہے' پھر اس کے والدین اسے یہودی بنا دیتے ہیں یا نصرانی بنا دیتے ہیں یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔"

صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے : ((اَوْ یُشَرِّكَانِهٖ)) "یا اسے مشرک بنا دیتے ہیں۔"

حواشی

(۱) پوری حدیث اس طرح ہے :

((اِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ الْاِحْسَانَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ فَاِذَا قَتَلْتُمْ فَاَحْسِنُوا الْقِتْلَةَ وَاِذَا ذَبَحْتُمْ فَاَحْسِنُوا الذِّبْحَ وَلْیُحِدَّ اَحَدُكُمْ شَفْرَتَهٗ فَلْیُرِحْ ذَبِیْحَتَهٗ))

"اللہ تعالیٰ نے ہر چیز میں عمدگی اور خوبصورتی کو فرض کیا ہے۔ چنانچہ جب کسی کو قتل کرو تو اچھے طریقے سے قتل کرو اور جب ذبح کرو تو اچھے طریقے سے ذبح کرو اور اپنی چھری کی دھار کو تیز کر لو تاکہ جانور کو آرام سے ذبح کیا جا سکے"۔ (صحیح مسلم کتاب الصید باب نمبر ۱ اور دیگر کتب حدیث)

(۲) جیسے حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کی کتاب ہے "مبدا و معاد"۔ یعنی جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ ہماری زندگی کے سفر کا آغاز کیا ہے اور اس کی آخری منزل کونسی ہے؟

سنی حکایت ہستی تو درمیان سے سنی
نہ ابتداء کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

تو اس کا منطقی نتیجہ نکلتا ہے کہ :

نہ ابتداء کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو یہ بھی کیا معلوم؟

اس کا نتیجہ Skepticism یا Agnosticism یعنی ارتیابیت لاادریت ہے۔

(۳) ڈاکٹر فضل الرحمٰن پاکستان میں بہت بدنام ہوئے۔ ان کے خلاف ۱۹۶۸ء میں ایجی ٹیشن بھی ہوا جو کہ ایوب کے زوال کا سبب بن گیا۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے وحی اور نبوت کا وہی تصور پیش کیا جو سابقہ فلاسفہ کا تصور تھا' بلکہ ان کی ڈاکٹریٹ کا تحقیقی مقالہ بھی اسی موضوع Concept of Prophethood in Islam پر تھا۔ اہل سنت اور متکلمین اسلام کے نزدیک یہ کفر کانیا ایڈیشن تھا' اس لئے ان کے خلاف بہت شدت سے تحریک چلی (ماخوذ)

(۴) صوفیاء سے مراد آج کے بھنگی' چرسی' قبروں کے مجاور یا بازاروں میں ننگ دھڑنگ پھرنے والے فاتر العقل لوگ قطعاً نہیں' بلکہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے خدمت اسلام کی خاطر ہر طرح کی مشقتیں برداشت کیں اور تمام ممکنہ وسائل کے ذریعے کلمۃ الاسلام لوگوں تک پہنچایا۔ (ابو عبدالرحمٰن)

(۵) صحیح البخاری کتاب الرقاق باب التواضع ح ۶۱۳۷

(۶) سنن الترمذی کتاب صفۃ القیامۃ باب ۵۹ ح ۲۵۱۶۔ امام ترمذی نے حدیث کو "حسن صحیح" قرار دیا ہے و مسند احمد ۱/ ۲۹۳ ح ۲۶۶۹ و ح ۲۷۶۳۔ (مسند عبداللہ بن عباس) استاذ احمد شاکر نے حدیث کو صحیح کہا ہے۔

(۷) مسند عبد بن حمید ص ۲۱۴ ح ۶۳۶ اور یہ روایت المثنی بن الصباح راوی کی وجہ سے ضعیف ہے ملاحظہ ہو مختصر الکامل لابن عدی ص ۴۰۷۔ حالاتِ زندگی نمبر ۱۹۰۲۔

(۸) صحیح مسلم کتاب القدر باب فی الامر بالقوۃ و ترک العجز ح ۲۶۶۴

(۹) قرآن حکیم میں یہ حقیقت ۳۹ مرتبہ بیان ہوئی ہے۔

(۱۰) صحیح البخاری کتاب المظالم باب لا یظلم المسلم المسلم ولا یسلمه ح ۲۳۱۰' و صحیح مسلم کتاب البر و الصلہ باب تحریم الظلم حدیث ۲۵۸۰' وسنن الترمذی کتاب الحدود باب ماجاء فی الستر علی المسلم حدیث ۱۴۲۶' وسنن ابی داؤد کتاب الادب باب المواخاۃ حدیث ۴۸۹۳۔

(۱۱) مسند احمد ۱/ ۳۹۱ ح ۳۷۱۲ و ۱/ ۴۵۲ ح ۴۳۱۸ و الاحسان ترتیب صحیح ابن حبان ۳/ ۲۵۳ ح ۹۷۲ و مسند ابی یعلی الموصلی ۹/ ۱۹۸ ح ۵۲۹۷ و المعجم الکبیر للطبرانی ۱۰/ ۲۹ ح ۱۰۳۵۲ و کشف الاستار عن زوائد البزار ۴/ ۳۱ ح ۳۱۲۲ و المستدرک للحاکم ۱/ ۵۰۹ علامہ الالبانی' استاذ احمد شاکر' استاذ الارناؤوط اور استاذ حسین سلیم اسد سب نے حدیث کو صحیح قرار دیا ہے اور معترضین کا مسکت جواب دیا ہے۔

(۱۲) تلاش بسیار کے باوجود صرف اتنا جملہ ملا ہے: "مَا عَبَدْنَاكَ حَقَّ عِبَادَتِكَ" ملاحظہ ہو المعجم الاوسط للطبرانی ۴/۳۴۵ ح ۳۵۹۴ تحقیق الدکتور محمود الطحان۔

(۱۳) صحیح البخاری کتاب الجنائز باب اذا اسلم الصبی فمات ح ۱۲۹۲ و ۱۲۹۳ و صحیح مسلم کتاب القدر باب کل مولود یولد علی الفطرۃ ح ۲۶۵۸ و دیگر کتب حدیث۔

نبی اکرمؐ کی اصل جلالتِ قدر اور عظمتِ شان کو
کوئی نہیں جان سکتا، مختصراً یہی کہا جا سکتا ہے کہ

"بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر"

ہمارے لیے اصل قابلِ غور مسئلہ یہ ہے کہ:—
کیا ہم آپؐ کے دامن سے صحیح طور پر وابستہ ہیں؟
اس لیے کہ اسی پر ہماری نجات کا دار و مدار ہے

اِس اہم موضوع پر

ڈاکٹر اسرار احمد کی مختصر لیکن نہایت مؤثر تالیف

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے

ہمارے تعلق کی بنیادیں

کا خود بھی مطالعہ کیجئے اور اس کو پھیلا کر تعاون علی البر کی سعادت حاصل کیجئے

علّامہ اقبال کے تصوّرات

تحریر : فرقان دانش خان

ہمارے ہاں شاعری ایک رسم و رواج یا ذریعۂ تفریح کی حیثیت رکھتی ہے لیکن علامہ اقبال شاعری کو یہ پست مقام دینے کیلئے تیار نہیں۔ وہ شاعری برائے شعروادب کے قائل نہیں، بلکہ شاعر برائے زندگی ہیں اور فن برائے فن کو نہ صرف خطرناک بلکہ مہلک قرار دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال نے اپنی فکر کے مقابلے میں فن کو کبھی قابل وقعت خیال نہیں کیا۔ ان کے نزدیک اصل اہمیت فکر، پیغام اور تصورات کو حاصل ہے۔ وہ شعر کی عام فنی خصوصیات پر زور دینے کی بجائے خیالات کی بلندی، ندرتِ افکار اور عملِ پیہم کا درس دیتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اقبال فنی اعتبار سے بھی اعلیٰ مقام پر فائز ہیں۔

شاعرِ مشرق علامہ اقبال جس دور میں پیدا ہوئے اس وقت ملت اسلامیہ زوال پذیر تھی۔ سلطنت مغلیہ کا سورج غروب ہو چکا تھا اور مسلم حکومتیں یکے بعد دیگرے ختم ہوتی جارہی تھیں۔ مسلم قوم تن آسانی کا شکار ہو کر ذلت و رسوائیوں کے عمیق گڑھے میں گر چکی تھی اور اس نے انگریزوں کے پہنائے ہوئے طوقِ غلامی کو اپنا مقدر سمجھ لیا تھا۔ اقبال کے سینے میں ایک دردمند دل تھا جو مسلمانوں کی زبوں حالی کو دیکھ کر تڑپ اٹھا۔ یہ تڑپ رفتہ رفتہ ناسور بن گئی اور یہ سوز و گداز اور غم والم ان کی زندگی کا سرمایہ ٹھہرا۔ انہوں نے سوئی ہوئی قوم کو جگانے اور اس کے تن مردہ میں روح پھونکنے کو اپنا مقصد حیات بنا لیا۔ چنانچہ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ان کی عظمت و مقبولیت کی اصل وجہ ان کی شاعری ہی ہے جس نے مسلم قوم کی مُردہ رگوں میں خون کی حرارت پیدا کرنے کے لئے آبِ حیات کا کام کیا۔ اقبال کی شاعری میں جو چیز سب سے اہم اور اکسیر ہے وہ اقبال کے تصورات اور نظریات ہیں۔ اقبال کے تصورات زندگی کی مثبت حقیقتوں کی حیثیت رکھتے ہیں جو ایک مؤمن اور مسلم معاشرے میں بدرجہ اتم موجود ہوتی ہیں۔ چنانچہ علامہ اقبال کی شاعری کے چند تصورات کا مختصر جائزہ ذیل میں پیش کیا جارہا ہے تاکہ آج ہماری زندگیوں میں پھر وہی انقلاب برپا ہو سکے جو قیام پاکستان سے پہلے مسلمانانِ ہند کی زندگیوں

میں اقبال کی شاعری کی بدولت رونما ہوا تھا۔

اقبال کا تصورِ حیات

اقبال کی شاعری میں "تصورِ حیات" زندگی کی ایک مثبت حقیقت کے طور پر اجاگر ہوتا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ زندگی کی جملہ کثافتوں سے بخوبی واقف ہیں۔ علامہ اقبال نے جو فلسفہ حیات پیش کیا ہے اس کے لئے محسن انسانیت ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سادہ زندگی کو مثال کے طور پر پیش نظر رکھا ہے۔

علامہ اقبال اپنے تصورِ حیات میں قاری کو زندگی سے فرار کی تعلیم نہیں دیتے۔ ان کے نزدیک افضل یہ ہے کہ آدمی نہ صرف جہان سے متعلق رہے، بلکہ اس کو تسخیر کرنے کی قوت بھی اس میں موجود ہونی چاہئے۔ ان کے نزدیک یہ کائنات ابھی نامکمل ہے اور انسان کا فرض ہے کہ وہ اس کائنات کے لامحدود خزانوں کی تلاش کرے اور اسے مکمل کرے۔ چنانچہ فرمایا ؎

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کُن فیکوں

علامہ اقبال اپنے اس تصور کی وضاحت میں جابجا سخت کوشی اور محنت کا درس دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ زندگی کا اصل مقصد صرف زندہ رہنا نہیں بلکہ زمانے کے غیر موافق حالات کو بدل کر انہیں اپنی ضروریات کے مطابق بنانا ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک یہ جدوجہد اور محنت زندگی کو رواں دواں رکھنے کا ذریعہ اور زندگی کا اصل مقصد ہے اور یہی جذبہ انسان کو صحابہ کرامؓ کی طرح زمانہ ساز بنا سکتا ہے۔ چنانچہ علامہ اقبال محنت اور جدوجہد کے ضمن میں یقین محکم اور عمل پیہم کی تلقین کرتے ہوئے زندگی کی حقیقت بتاتے ہیں ؎

زندگانی کی حقیقت کوہ کَن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مَردوں کی شمشیریں

شاعر مشرق نے ہمیں حرکت و عمل کا جو تصور حیات دیا ہے، وہ نہایت وسیع ہے اور اقبال

کی شاعری کے جن تصورات کی آگے تشریح کی جارہی ہے وہ بیک وقت اقبال کے تصورِ حیات میں کارفرما ہیں۔

اقبال کا مَردِ مؤمن

اقبال کا مَردِ مؤمن وہ کامل انسان ہے جسے ہر زمانے میں پانے کی خواہش کی گئی ہے اور جس کے کردار کے خاکے کئی مفکرین نے پیش کئے۔ کہا جاتا ہے کہ اقبال کا مَردِ مؤمن ایک جرمن فلاسفر نطشے کے تخلیق کردہ کردار سُپرمین (super man) سے ماخوذ ہے' لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے کیونکہ نطشے کا سپرمین جنگ عظیم میں انسانی تباہ کاریوں کے ردعمل کے طور پر محض ایک تصوراتی کردار ہے' جو صرف اور صرف جسمانی طاقت و قوت کا مظہر ہے اور فراست و تکبر اس کے اعلیٰ ترین جوہر ہیں۔ گویا نطشے کا سپرمین انتہا پسندی' سیاسی اقتدار اور نسلی امتیاز کی پیداوار ہے اور ہر قسم کی اخلاقی اقدار کی نفی کرتا ہے۔ جبکہ اقبال کے ہاں یہ تصور بالکل مختلف ہے۔ وہ اپنے مَردِ مومن کو قرآنی آیات کے سانچے میں ڈھال کر اسے کردارِ محمدی (علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) کا پرتو دیکھنے کے خواہش مند تھے۔ ان کا مَردِ مؤمن جہاں مادی دنیا کی بڑی سے بڑی قوت کو تسخیر کرنے کی اہلیت رکھتا ہے' وہاں اپنے زورِ بازو سے حاصل شدہ چیز کو دوسروں کی خدمت اور بھلائی کیلئے وقف کردینے کی صفت بھی رکھتا ہے۔ اقبال مؤمن کی تعریف میں رقم طراز ہیں ؎

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مؤمن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

یہ وہ مقام ہے جہاں اس مَردِ کامل کا ہاتھ خدا کا ہاتھ بن جاتا ہے۔ اسی تصور کو اقبال نے نہایت حسین پیرایہ میں اس طرح پیش کیا ؎

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مؤمن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں' کار کشا' کارساز

اقبال کے نزدیک جب مَردِ مؤمن میں خدائی صفات کا پرتو پایا جاتا ہے تو اس میں قہر و غضب اور غفاری و درگزر کی صفات بھی پیدا ہو جاتی ہیں اور وہ ان عناصر کے بغیر حقیقی مسلمان نہیں بنتا۔ فرمایا ؎

قہّاری و غفّاری و قُدّوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

لیکن یہاں یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ اقبال کا مردِ مؤمن صرف غیظ و غضب کی علامت ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ رحم اور لطف و کرم کی صفات بھی اس میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ علامہ اقبال کے نزدیک ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مؤمن

اقبال کا مؤمن تند مزاج نہیں ہوتا۔ دنیا کی کوئی بات اس کی نظر میں مشکل نہیں ہوتی۔ زندگی کے حادثات کو وہ صبر و تحمل سے برداشت کرتا ہے۔ وہ کسی کا ممنون احسان ہونا پسند نہیں کرتا۔ وہ ایک قابل سپہ سالار کی طرح اپنے محدود وسائل کو نہایت دُور اندیشی سے استعمال کرتا ہے۔ اقبال پاکبازی' نرم مزاجی اور سخت کوشی کو بھی انسانِ کامل کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ ؎

نرم دمِ گفتگو ' گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

اقبال کا مردِ کامل روح کی اعلیٰ قوتوں کا منبع بھی ہے۔ وہ ایمان و یقین کی بدولت مادہ پر قابو رکھتا ہے۔ اسکے کردار کا جوہر نہایت درخشاں ہے۔ اسکی قوت مادی کائنات کو مسخر کرنے کی ہمت رکھتی ہے۔ قوموں کی تقدیریں اس کی نگاہوں کے اشارے سے بنتی ہیں ؎

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مؤمن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں!

اقبال کا تصورِ ملّت

انگریزی زبان میں ملت یا قوم کے مترادف ایک لفظ نیشن (nation) ہے لیکن انگریزی لفظ نیشن اقبال کے ہاں ملت کا بدل نہیں ہے کیونکہ مغرب کے تصور کے مطابق قوم رنگ' نسل' زبان یا علاقائی درجہ بندی سے ظہور میں آتی ہے جبکہ مسلم ملت میں یہ امتیاز نہیں۔ مسلمان دنیا کے کسی خطے میں رہتا ہو' کوئی زبان بولتا ہو یا کسی بھی رنگ و نسل

سے تعلق رکھتا ہو' مسلم ملت یا امت کا حصہ ہے اور ساری دنیا میں بسنے والے مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ چنانچہ اقبال کے ہاں ہمیں جو تصورِ ملت جلوہ افروز نظر آتا ہے وہ صرف اور صرف اسلامی تصور ہے' جس کے مطابق مسلم ملت کی اساس دیگر اقوام کی اساس سے مختلف ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر — خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار — قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

اقبال کا تصورِ ملت نسل پرستی اور تنگ نظری سے بالاتر ہے۔ وطن پرستی اس حد تک کہ مادہ پرستی ہو جائے' اقبال کے ہاں قابل قبول نہیں' کیونکہ یہ جذبہ آدمی کو نیچے ہی لے کر جاتا ہے' جبکہ اقبال ہر مقام پر انسان کے لئے اعلیٰ و ارفع مقام تجویز کرتے ہیں۔ یہ بات ان کے تصورِ ملت کی بھی بنیاد ہے۔

تصورِ شاہین

اقبال کی شاعری میں جن تصورات نے بلند مقام حاصل کیا ہے' ان میں شاہین کا تصور خاص اہمیت کا حامل ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں اقبال کی جو شاعری ملتی ہے وہ حب الوطنی اور حسن تحریر کی آئینہ دار تھی۔ یورپ کے سفر کے دوران انہوں نے جن فطری اثرات کو قبول کیا' ان میں نطشے کا فلسفہ قوت و زندگی اہم ہے۔ گو اقبال کا فلسفہ قوت و زندگی نطشے کے تصور کے برعکس ہے' تاہم اقبال کی شاعری اسی طرح فکری منازل طے کرتی ہوئی ایک ایسے مقام پر آ پہنچی جہاں ان کے ذہن میں شاہین کا تصور ابھرا' جس کا حوصلہ اس کی اُڑان کی طرح مضبوط اور مستحکم ہے۔ ؎

تو شاہین ہے پرواز ہے کام تیرا — ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

دراصل علامہ اقبال نے شاہین کو علامت کے طور پر اپنایا ہے اور ایک مسلم نوجوان کو شاہین کا درجہ دیا ہے۔ اقبال کا شاہین ایک ایسا نوجوان ہے جو مضبوط ارادے' بلند ہمت اور سخت مشقت کا عادی ہے۔ اقبال کا نوجوان شاہین کے روپ میں جن فضاؤں میں محوِ پرواز ہے وہ مغربی تصورات کی پہنچ سے دور ہیں۔ بقول اقبال ؏

کرگس کا جہاں اور ہے ' شاہیں کا جہاں اور!

اقبال نے جب شاہین کا تصور اپنایا تو شاہین کی فطرت کو درویشی' قلندری' خودداری اور

بے نیازی کی اعلیٰ صفات کا رنگ دیا۔ ؎

پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ!

علامہ اقبال شاہین کو جرأت مند اور چست و چالاک نوجوان کے روپ میں پیش کرتے ہوئے اس کی ایک خصوصیت بتاتے ہیں ؎

جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ!

اقبال کا تصورِ خودی

اقبال کے ہاں خودی احساس ذات کا نام ہے، جس کا مطلب ہے کہ انسان اپنی صلاحیتوں کو پہچانے اور انہیں استعمال میں لاتے ہوئے انسانیت کے اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے وقف کر دے۔ گویا خودی سے مراد اپنی ذات اور صلاحیتوں کو پہچانتے ہوئے انہیں اجاگر کرنا ہے۔

علامہ کے نزدیک جذبۂ خودی پوری انسانی زندگی میں جاری و ساری ہے۔ اسی کی بدولت زندگی میں حرارت، تڑپ اور حرکت ہے۔ چنانچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسان کی زندگی، مسلسل حرکت اور عمل پیہم کا محرک خودی ہے۔ اسی لئے انسان ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتا ہے اور خودی کی تحقیق و تکمیل کی جستجو کسی مقام پر ختم نہیں ہوتی۔ علامہ اقبال کے ہاں خودی سمندر کی مانند وسعت رکھتی ہے، فرماتے ہیں کہ ؏

خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارا نہیں

اقبال کے نزدیک خودی کی تکمیل کا راز تین مراحل میں پنہاں ہے، یعنی اطاعت، ضبط نفس اور نیابت الٰہی۔ چنانچہ اقبال فرماتے ہیں کہ انسان کے مرد کامل بننے کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان تین مراحل کو طے کرے اور خود کو پستیوں سے نکال کر ایسی بلندیوں پر لے جائے جہاں خدا بھی اپنی مرضی کو اس کے ارادے پر چھوڑ دے۔ فرمایا ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے؟

اقبال کہتے ہیں کہ اگر خودی کو مطلق العنان چھوڑ دیا جائے تو یہ شیطانی قوت بن جاتی ہے جس کا کام قتل و غارت اور فساد کے سوا کچھ نہیں۔ ہٹلر اور مسولینی کی صورت میں ہمیں اس کی مثال ملتی ہے۔ لیکن اگر خودی کو کسی ضابطے کا پابند کر دیا جائے اور وہ ضابطہ صرف اور صرف قانونِ الٰہی ہو تو اقبال کا تصورِ خودی وجود میں آتا ہے۔ چنانچہ اقبال کے نزدیک خودی کو جلا بخشنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ قانونِ الٰہی کی پابند ہو اور اپنے خالق کی یاد سے غافل نہ ہو۔ کیونکہ ؎

خودی کا سرِّ نہاں لا الٰہ اِلاّ اللہ
خودی ہے تیغ فساں لا الٰہ اِلاّ اللہ

اقبال کا تصورِ عشق

صدقِ خلیلؑ بھی ہے عشق صبرِ حسینؓ بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

اقبال کی شاعری میں عشق کا تصور دوسرے قدیم شعراء سے مختلف ہے۔ اقبال کے ہاں عشق سے عورت اور مرد کی محبت یا وطن کی محبت مُراد نہیں بلکہ ان کے ہاں یہ ایک ایسی لگن اور جذبے کا نام ہے جس کے تحت بڑے سے بڑا مشکل کام بھی آسان ہو جاتا ہے۔ وہ کام جو عقل انسانی میں نہیں آتے یا بظاہر ناممکن نظر آتے ہیں اور جو کام عقل صدیوں نہیں کر پاتی، اقبال کا جذبۂ عشق چند لمحوں میں کر دیتا ہے۔ اقبال کے اس جذبے اور تصور کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ قیام پاکستان جیسا مشکل کام اسی جذبے کے باعث ظہور پذیر ہوا۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا کربلا کے میدان میں اسلام کی سربلندی کے لئے جذبۂ شہادت اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خدا کی مرضی کی خاطر آگ میں کودنا یا جوان بیٹے کو رضائے الٰہی کے لئے ذبح کرنے کو تیار ہو جانا، اقبال کے تصورِ عشق کی بہترین مثالیں ہیں۔ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ اقبال کا تصورِ عشق محض رضائے الٰہی اور خوشنودیٔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے جذبہ پر مبنی ہے اور اقبال کے نزدیک یہ تصور یا جذبہ ہر مسلمان کے دل میں موجزن ہونا ضروری ہے۔ ○○

دین میں علم کی اہمیت

(گزشتہ سے پیوستہ)

کرنل (ر) محمد یونس

اس مقام پر اللہ تعالیٰ کی معرفت کے ضمن میں چند روشن دلائل، جو سائنسی علوم سے حاصل ہوتے ہیں، ان کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا۔

(1) ایک متوسط انسان کے وجود میں تقریباً 6.7×10^{27} جواہر (atoms) پائے جاتے ہیں۔ ایک جوہر اتنی دقیق ہستی ہے کہ ایک برقیاتی خورد بین (Electronic Microscope) اپنی ایک لاکھ گنا تکبیری طاقت کے باوجود اسے انفرادی طور پر نہیں دکھلا سکتی۔ اب ایک جوہر کا 99.9 فیصد مواد اس کے مرکزے میں مجتمع ہوتا ہے جو جوہر کے مقابلے میں بھی نہایت خفیف ہوتا ہے۔ اوسطاً ایک جوہر کا قطر اس کے مرکزے کے قطر سے دس ہزار گنا بڑا ہوتا ہے اور چونکہ کسی کرے کا حجم اس کے قطر کے مکعب کے متناسب ہوتا ہے لہٰذا ایک معین جوہر بھی اپنے مرکزے سے دس کھرب گنا (trillion times) بڑا ہوتا ہے۔ اب ان اعداد و شمار کو ذہن میں مستحضر رکھتے ہوئے اندازہ کیجئے کہ ایک جوہر کا مرکزہ کس قدر ناقابل فہم حد تک حقیر ہستی ہے، لیکن قادرِ مطلق نے اس مرکزے کو یکجا رکھنے کے لئے جو نووی بند توانائی (Nuclear binding energy) فراہم کی ہے وہ اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب ایک مرکزے کا انشقاق واقع ہوتا ہے۔ U-235 کے ایک مرکزے کے انشقاق سے 200 Mev (Million electron volts) توانائی رہا ہوتی ہے۔ اس حقیقت کے افشاء نے Atom bomb بنائے جانے کی راہ ہموار کی۔ اس تخلیق میں فن تعمیر کے کمال کا مظاہرہ ہے۔ کیونکہ کائناتِ اصغر (Microcosm) یعنی ذرات کی دنیا کائناتِ اکبر (Macrocosm) کا نقش ثانی ہے، جہاں الیکٹران (یا برقیے) چھوٹے چھوٹے سیاروں کی طرح مرکزے کے گرد نہایت سرعت سے گھوم رہے ہیں اور وحدت کائنات

پر شہادت دے رہے ہیں۔ ایک جوہر کا کمالِ فن تعمیر اور کیمیائی تجزیہ نہ صرف فہم انسانی کے لئے ایک چیلنج ہے بلکہ فاطر کائنات کی حیرت انگیز تخلیقی قوتوں اور بے پناہ علم و دانش کا منہ بولتا ثبوت بھی ہے۔ اگر اس پر بھی کوئی شخص اللہ کی ہستی کا اقرار نہیں کرتا تو وہ ایک سائنس دان تو ہو سکتا ہے لیکن عقل سلیم کا مالک انسان ہرگز نہیں ہو سکتا۔ وہ یقیناً تحت الانسانی سطح پر زندگی بسر کر رہا ہے۔

(2) اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات پیدا فرمایا ہے' لیکن اس کی ابتداء مٹی سے کی جو عناصر اربعہ یعنی آگ' پانی' ہوا اور مٹی میں سے حقیر ترین عنصر ہے۔ اس کے جسم کے اجزائے ترکیبی کا تناسب کچھ اس طرح ہے کہ اس میں 65 فیصد آکسیجن' 18 فیصد کاربن' 10 فیصد ہائیڈروجن' 3 فیصد نائٹروجن' 3 فیصد کیلشیم اور ایک فیصد فاسفورس ہے۔ ان چھ عناصر کا مجموعہ انسانی جسم کا 99 فیصد بنتا ہے۔ باقی ماندہ ایک فیصد میں کئی علامتی عناصر ہیں۔ مثلاً بنفشین (iodine)' لوہا (Iron)' تانبا (Copper)' کوبالٹ (Cobalt)' میگنیشیم (Magnesium)' منگنیز (Manganese)' نمک (Na Cl)' پوٹاشیم (Potassium) اور جست (Zinc)۔ اب آپ خلاق العظیم اللہ کے اس تخلیقی کارنامے پر غور کیجئے کہ اپنی بہترین مخلوق کی ابتداء حقیر ترین عنصر سے فرمائی جو Engineering Economics کے لحاظ سے کمالِ صناعی کا مظاہرہ ہے اور پھر اپنی قدرت' ندرت اور رعنائی کا اظہار یوں فرمایا ہے کہ ان چھ عناصر سے پیدا ہونے والے اربوں بلکہ کھربوں انسان نہ صرف اپنی ظاہری شکل و شباہت میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں بلکہ Genetically بھی منفرد ہیں۔ یہ ذاتی تشخص ہر خلئے میں موجود ہے' خصوصاً چھوٹے لِمفی خلیوں میں' جو پورے جسم میں ذاتی شناخت یا نشاندہی کے لئے رواں دواں رہتے ہیں۔ ذاتی تشخص کی یہ خصوصیت نہ صرف انسانوں میں موجود ہے بلکہ حیوانوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ کیا یہ اندھے' بہرے مادے کی کارستانی ہو سکتی ہے؟

3) ہم میں سے ہر شخص خلا میں ایک نہایت پیچیدہ راستے پر رواں دواں ہے۔ ہماری زمین بیک وقت تین سفر کر رہی ہے۔ اولاً ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے محوری گردش میں مصروف ہے۔ ثانیاً 6800 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سورج کے گرد مداری گردش پر گامزن ہے اور ثالثاً 44000 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے پورے نظامِ

شمسی کے ہمراہ مرکز کہکشاں کے گرد گھوم رہی ہے۔ کیا آپ نے کبھی اس رفتار کو محسوس کیا ہے؟ مگر آپ سب نے کسی موٹر کار یا بس میں سفر کرتے ہوئے یہ مشاہدہ تو ضرور کیا ہو گا کہ اگر گاڑی کے پہیے متوازن (Balanced) نہ ہوں تو رفتار بڑھنے سے گاڑی میں ڈگمگاہٹ پیدا ہو جاتی ہے جو صرف ایک دواری گردش (Rotary motion) کی وجہ سے ہے۔ اب آپ خداوند قدوس کی کاریگری کے کمال کا اندازہ لگائیے کہ کس نفاست سے اس زمین کو توازن عطا کیا ہے کہ بیک وقت تین مختلف الانواع حرکات کے باوجود اس میں کوئی قابل ادراک تھرتھراہٹ نہیں۔ اسی حقیقت کے پیش نظر ایک سائنسدان یہ کہنے پر مجبور ہوا کہ :

God Almighty must have balanced this trembling Universe with utmost precision

اس ناقابل فہم توازن کو برقرار رکھنے کے لئے اس خلاق العظیم نے زمین پر پہاڑ نصب فرما دیئے۔ چنانچہ ارشاد ہے ﴿ وَ اَلْقٰی فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِکُمْ ﴾ "اور اس نے زمین میں پہاڑ قائم کر دیئے مبادا کہ وہ تمہیں لے کر کسی طرف جھک جائے"۔

4) اور پھر زمین کے اردگرد تقریباً 200 میل تک ہوائی کرہ پھیلا ہوا ہے جس کے بغیر ہماری زندگی ناممکن ہو جاتی۔ یہ ہوائی کرہ سات مختلف خصوصیات کے حامل طبقات پر مشتمل ہے۔ مثلاً

Troposphere, Stratosphere, Mesosphere, Chemosphere, Thermosphere, Ionosphere and Exosphere.

Troposphere موسم اور بادلوں کا خطہ ہے جس میں بلندی میں اضافے کے لحاظ سے حرارت کم ہوتی جاتی ہے اور ہوائی دباؤ بھی اسی تناسب سے کم ہوتا جاتا ہے۔ منطقات معتدلہ (Tropical Regions) میں سطح سمندر پر درجہ حرارت 15c اور ہوائی دباؤ 14.7 lb./sq.in. ہوتا ہے جبکہ سات میل کی بلندی پر درجہ حرارت منفی 56c ہو جاتا ہے اور ہوائی دباؤ 4.9 lb./sq.in. رہ جاتا ہے۔ اس کے اوپر ایک خطہ ہے جو Tropopause کے نام سے موسوم ہے۔ یہاں قدرت نے اوپر اور نیچے کے طبقات کے مقابلے میں ایک ماحولیاتی ثبات پیدا کر دیا ہے۔ چنانچہ یہ خطہ موسم کے اثرات سے محفوظ ہے اور عموماً ہمارے Jet Airliners اس خطے میں پرواز کرتے ہیں۔ اسی

لئے تو ارحم الراحمین نے فرمایا ہے کہ ﴿ وَاٰتٰكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ۭ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۭ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ۝ ﴾ (ابراہیم : 34) "اور عطا کیا تم کو ہر اس چیز میں سے جو تم نے مانگی (یا مانگنا چاہتے) اور اگر تم لوگ اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو نہیں کر سکتے۔ یقیناً انسان ظالم اور ناشکرا ہے"۔ Stratosphere ہوائی کرے کا وہ خطہ ہے جہاں بلندی کے ساتھ ساتھ درجہ حرارت بھی بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس کے بعد Mesosphere کا طبقہ ہے جہاں بلندی کے ساتھ درجہ حرارت گرتا چلا جاتا ہے۔ اس کے اوپر Chemosphere ہے جہاں Photochemical Reaction یعنی ضیائی کیمیائی تعامل شروع ہو جاتا ہے۔ یہ کیمیائی تعامل بالائے بنفشی شعاعوں کے زیر اثر شروع ہوتا ہے۔ اس خطے میں قدرت نے Ozone گیس جمع فرمادی ہے جو بالائے بنفشی شعاعوں کو جذب کر کے سورج کے مضر اثرات سے زمین کے مکینوں کو محفوظ رکھنے میں صف اول کے دفاع کا کام کرتی ہے۔ اس کے اوپر Ionosphere کا طبقہ ہے۔ یہ بالائی ماحول کا علاقہ ہے جہاں ہوا کے ذرے بالائے بنفشی شعاعوں کے زیر اثر برقی باردار ہو جاتے ہیں اور اس رواں سازی (Ionization) کی وجہ سے چار تہوں میں مجتمع ہو جاتے ہیں۔ مثلاً D-layer، E-layer، F-1 layer اور F-2 layer ـــــ long radio waves کو E-layer منعکس کرتا ہے اور Short Radio waves کو F-layer منعکس کرتا ہے۔ F-layer ہی وہ علاقہ ہے جو شہابِ ثاقب کی مزاحمت کر کے انہیں جلا دیتا ہے۔ Exosphere کا طبقہ اس کے اوپر آتا ہے، جہاں ہوا اس قدر لطیف ہو جاتی ہے کہ زمین کی سطح کے مقابلے میں اس کی کثافت دس کھرب واں حصہ (one million-millionth) رہ جاتی ہے۔ یہ قطعہ بین السیارات فضائے بسیط تک جا کر ختم ہو جاتا ہے۔

(5) ہمارا سورج زمین سے 9 کروڑ 30 لاکھ میل کے فاصلے پر نصب کردہ ایک عظیم پاور ہاؤس ہے۔ اس کا اپنا ایک نظام ہے جسے نظامِ شمسی کہتے ہیں۔ اللہ نے نظامِ شمسی میں سورج کو صدر کی حیثیت دے رکھی ہے۔ اس کا قطر 14 ملین کلو میٹر ہے جبکہ زمین کا قطر صرف 12740 کلو میٹر ہے۔ اس کا مواد زمین سے 330,000 گنا زیادہ ہے۔ اگر سورج کو ایک خول تصور کیا جائے تو اس کے اندر 14 لاکھ زمینیں سما سکتی ہیں۔ اس کی عمر کا صحیح

اندازہ تو صرف اللہ کو ہے تاہم سائنس دانوں کے تخمینے کے مطابق اس کا life span 10,000 ملین سال ہے۔ اس کی موجودہ عمر 4600 ملین سال ہے۔ یعنی سورج اس وقت اپنے جوبن پر ہے۔ اس طویل المیعاد کارگزاری کے دوران نہ اس کی تمازت میں کوئی کمی واقع ہوئی ہے اور نہ اس کی رفتار میں' اور نہ ہی یہ اپنے مدار سے سرمو سرکا ہے۔ ذرا غور فرمایئے! اگر ایک ملین سال کے عرصہ میں اس کی رفتار میں ایک سیکنڈ کی کمی بیشی بھی واقع ہو جاتی تو اب تک 4600 سیکنڈ کا فرق واقع ہو جاتا۔ اندازہ لگایئے کہ خدائے ذوالجلال کی صناعی کس قدر کامل ہے' اس کی منصوبہ بندی کتنی بے عیب ہے' اس کا علم کتنا ہمہ گیر و لامحدود ہے اور اس کی تخلیق میں اور پیش بینی میں کس درجے کی precision ہے۔ اب سورۂ یٰسین کی آیت 38 ذہن میں لایئے جہاں ارشادِ باری ہے : ﴿ وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ۝ ﴾ "اور سورج اپنے مقرر کردہ راستے پر چل رہا ہے' یہ خدائے غالب و دانا کی منصوبہ بندی ہے"۔ اب آپ خود ہی فیصلہ کیجئے! کیا مذکورہ بالا حقائق تک رسائی ہم بغیر علم و تحقیق کے حاصل کر سکتے تھے؟ کیا خداوند قدوس کی اس عظیم صناعی کو بھانپ سکتے تھے؟ اسی لئے علامہ اقبال نے فرمایا :

گر تو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

لیکن کیا قرآن کا مقصد نزول' جو ہماری رہنمائی اور ہدایت کے لئے حتمی اور یقینی سرچشمہ ہے' بغیر سمجھ بوجھ کے اس کی تلاوت سے حاصل ہو سکتا ہے یا بغیر فہم و ادراک کے اسے رٹ لینے سے وہ ہدایت اور رہنمائی نصیب ہو سکتی ہے؟ لیکن اتنا بڑا سورج بھی ربّ العالمین کی صنّاعی میں صرف ایک چراغ کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ سورۃ الفرقان میں اسے چراغ (سراج) ہی کا نام دیا گیا ہے : ﴿ تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًا ۝ ﴾

(6) اس وسیع و عریض کائنات میں دیو پیکر یعنی Gaints and Super Giants بھی موجود ہیں' مثلاً کینوپس (Canopus) سورج سے 200 گنا بڑا اور 1500 گنا زیادہ منور ستارہ ہے۔ اس کا قطر 27 کروڑ 68 لاکھ میل ہے اور زمین سے

اس کا فاصلہ 93 نوری سال ہے۔ (نوٹ کیجئے کہ روشنی کی رفتار 186,000 میل فی سیکنڈ ہے لہٰذا ایک سال میں روشنی 58 کھرب' 165 ارب' 69 کروڑ اور 60 لاکھ میل کا سفر طے کرتی ہے۔ اس فاصلہ کو نوری سال کہتے ہیں۔ جو وسعت کائنات کی پیائش کے لئے اکائی ہے۔ Antares سورج سے 430 گنا بڑا اور 500 گنا زیادہ منور ستارہ ہے' اس کا قطر 59 کروڑ 52 لاکھ کلو میٹر ہے اور یہ ہم سے 330 نوری سال کے فاصلے پر ہے۔ Betelgeuse سورج سے 500 گنا بڑا اور 17000 گنا زیادہ منور ستارہ ہے۔ اس کا قطر 69 کروڑ 20 لاکھ کلو میٹر ہے۔ یہ زمین سے 270 نوری سال کے فاصلے پر ہے۔ اسے آسمان میں نظر آنے والے ستاروں کا شہنشاہ مانا گیا ہے۔ اس کے شعلے 5 کروڑ میل تک بلند ہوتے ہیں۔ سفائی (W-Cephie) سورج سے ایک ہزار گنا بڑا ہے اور اس کا قطر 86 کروڑ 50 لاکھ میل ہے۔ Auriga Constellation میں ایک ستارہ آری گائی (Aurigai) ہے۔ یہ سورج سے 2000 گنا بڑا ہے۔ اس کا قطر ایک ارب 73 کروڑ میل ہے۔ اس سے اٹھنے والے شعلوں کا اندازہ کرنا ممکن نہیں' کیونکہ بے انتہا دور ہونے کی وجہ سے اس کی مکمل تحقیقات ابھی تک حاصل نہیں ہو سکیں۔ اگر آری گائی کو سورج کے مدار میں رکھ دیا جائے تو یورینس سیارہ اس کے محیط کے اندر آجائے گا اور نظامِ شمسی کی آخری حدوں تک شعلے ہی شعلے ہوں گے۔ یہ سب ستارے آگ کے کرے ہیں جن کے شعلے کروڑوں میل بلند ہوتے ہیں۔ ان کی مہیب اور دہشت ناک شکل اللہ تعالیٰ کی قوتِ جلالی کا ادنیٰ مظاہرہ پیش کرتی ہے۔ S.Doradus ہم سے 150,000 نوری سال کے فاصلے پر واقع ہے اور ہمارے سورج سے 5 لاکھ گنا زیادہ روشن ہے۔ اس کی چمک کے سامنے ہمارے سورج کی چمک ایک ادنیٰ چراغ کی حیثیت بھی نہیں رکھتی۔ کچھ عرصہ قبل آسٹریلوی اور برطانوی سائنس دانوں کی ٹیم نے ایک Quasar کا انکشاف کیا ہے اور اس کا نام Pks 8000 minus 300 رکھا ہے۔ یہ زمین سے 18 بلین نوری سال کے فاصلے پر ہے اور یہ بعید ترین اور منور ترین معروض ہے جو کائنات میں ایک سو ملین ملین سورجوں کی روشنی بکھیر رہا ہے۔ ان چند مثالوں سے آپ اللہ تعالیٰ کی شانِ خلاقی اور کبریائی پر غور کیجئے کہ کس نفاست اور کس کمال قدرت و حکمت سے ان کو پابند نظم و ضبط کر رکھا ہے کہ ان بے شمار اجرام فلکی میں سے کوئی نہ تو اپنے مدار سے بال برابر سرک سکتا

ہے اور نہ یہ ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں' حالانکہ حیرت انگیز رفتاروں سے رواں دواں ہیں۔ کائنات میں ہر سو حرکت ہی حرکت ہے اور حرکت بھی بے پناہ۔ بقول علامہ اقبال ؎

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات اِک تغیر کو ہے زمانے میں

اسی طرح کائناتِ اکبر (Macrocosm) یعنی ارض و سماوات کی دنیا اس قدر وسیع' پُراسرار اور پیچیدہ ہے کہ نہ تو فہم انسانی اس کا احاطہ کر سکتا ہے اور نہ موجودہ آلاتِ بینائی اس کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ یہ بیکراں فضائیں' جو بڑی سے بڑی دُوربین کی زد سے باہر ہیں' اللہ تعالیٰ کی دانش و ذہانت کی علامات ہیں۔ ہماری کہکشاں ستاروں کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں ستاروں کے علاوہ کثیر مقدار میں دخانی مادہ بھی موجود ہے۔ اس کے اندر تقریباً ایک لاکھ ملین ستارے رواں دواں ہیں۔ اس کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک ایک لاکھ نوری سال کا فاصلہ ہے۔ ہر ستارے سے دوسرے ستارے تک کھربوں میل تک کا فاصلہ ہے۔ اس عظیم کائنات میں ہماری کہکشاں جیسی کھربوں کہکشائیں گردش میں ہیں۔ ہر کہکشاں اپنا ایک الگ وجود اور آزاد حیثیت رکھتی ہے۔ یہ اپنے مراکز کے گرد بھی گھومتی ہیں اور ساتھ ہی اپنے مقام سے دُور چلی جا رہی ہیں۔ ہماری کہکشاں ان تمام ستاروں کے ساتھ جو آسمان میں نظر آ رہے ہیں' 4 لاکھ 68 ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے شمال کی طرف دوڑی جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ 3 اور کہکشائیں بھی برہنہ آنکھ سے دیکھی جا سکتی ہیں۔ ایک کا نام Andromeda ہے اور دوسری دو Magellanic clouds کہلاتی ہیں۔ اینڈرومیڈا سب سے بڑی ہے' اس میں 10^{16} سورجوں کے مادہ سے بھی زیادہ مادہ موجود ہے۔ اس میں سینکڑوں عظیم الشان ستارے ہیں جو ہمارے انثارس اور بٹل گیز سے بھی کئی گناہ بڑے اور زیادہ منور ہیں۔ یہ کہکشاں ہم سے 21 لاکھ 80 ہزار نوری سال کے فاصلے پر ہے۔ میگلانک کلاؤڈز میں سے پہلی ہم سے ایک لاکھ 70 ہزار نوری سال اور دوسری 2 لاکھ نوری سال دُور ہے۔ ان دونوں میں مجموعی طور پر ایک کھرب سے بھی زائد ستارے ہیں جن میں کئی عظیم اور عظیم تر ہیں۔ ان کے علاوہ ان کہکشاؤں میں بے انتہا منور ستارے بھی پائے جاتے ہیں۔

Mount Wilson Palomar کی رصد گاہ میں نصب کردہ دو سو انچ لمبی دوربین سے تقریباً ایک ارب کہکشائیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ اس وسیع و عریض کائنات میں چاروں طرف کہکشائیں ہی کہکشائیں ہیں جو کھربوں کی تعداد سے بھی زیادہ ہیں۔ بہرحال ان کی تعداد کا صحیح علم تو اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی :

﴿ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ﴾ (المدثر : 31)

"اور اللہ کے لشکروں کا علم صرف اللہ ہی کو ہے۔"

پیٹر مل مین لکھتا ہے کہ دور افتادہ کہکشاؤں (Galaxies) اور جھمگٹوں (Clusters) کو دیکھنا انسان کی قوت سے باہر ہے' اس لئے کہ وہ بے انتہا دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کائنات کی وسعتوں کو محدود نہیں رکھا' بلکہ وہ بڑھتی ہی جا رہی ہیں۔ کائنات کی یہ وسعتیں ہمارے لئے سوائے حیرت کے کچھ نہیں۔ ہمارے اعداد و شمار ان کے سامنے بیکار ہیں۔ یہ عجائباتِ ارض و سماء ان لوگوں کے لئے لمحۂ فکریہ ہیں جو اس کائنات کی وسعتوں کو محدود سمجھتے ہیں یا اس کی تخلیق کو دیوی دیوتاؤں کی طرف منسوب کرتے ہیں یا مادہ کو ہیولیٰ اول گردانتے ہوئے اسے ازلی و ابدی قرار دیتے ہیں یا اس کائنات کی تخلیق کو ایک حادثہ تصور کرتے ہیں' کیونکہ سائنس کی اب تک کی معلومات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ :

(ا) اس کائنات کی وسعت بیکراں ہے۔

(ب) یہ کائنات ایک نہایت مربوط و منظم سلسلۂ کون و مکان ہے' جس میں ہر سو ترتیب' متانت اور استقامت کا مظاہرہ ہے۔

(ج) مظاہر قدرت کی ہر چیز کی ایک معین عمر ہے جس کے اختتام پر وہ فنا ہو جاتی ہے' حتیٰ کہ الیکٹران' پروٹان اور نیوٹران وغیرہ بھی۔

(د) اس کائنات کی ہر چیز مادی ہے لیکن خود مادہ کہاں سے اور کیونکر وارد ہوا' اس کا کوئی معقول جواب نہ سائنس دے سکتی ہے اور نہ ہی کوئی سائنسدان۔

(ھ) سائنس دانوں کا آخری مفر (escape) یہ ہے کہ مادہ پہلے سے موجود تھا۔ ابتداءً وہ ہستی کے تمام کمالات سے عاری تھا۔ نہ اس میں زندگی تھی' نہ علم' نہ ارادہ' نہ شعور' نہ قدرت۔ پھر رفتہ رفتہ ارتقاء کے مختلف مدارج سے کرتے ہوئے خود بخود

اس میں ان نابود اور معدوم اوصاف کا نمود شروع ہوا' یعنی جو نہ تھا وہ ہوا اور ہو رہا ہے۔ بالفاظ دیگر نیستی سے ہستی کی پیدائش ہوئی اور ہو رہی ہے۔ یہ ایک نہایت احمقانہ ادعا ہے جس کے لئے ان کے پاس کوئی علمی یا عقلی دلیل نہیں۔ ایک طرف تو وہ کسی غیر محسوس اور غیر مشہود ذات کے وجود کے منکر ہیں اور دوسری طرف بے بس و مجبور ہیں کہ نہ صرف مادہ کے از خود موجود ہو جانے کے قائل ہو رہے ہیں بلکہ نہایت ڈھٹائی کے ساتھ اس میں تمام صفاتِ کمال کے خود بخود نمودار ہونے کا دعویٰ بھی کر رہے ہیں۔ یہ عقلی فقدان اور غیر معقول استدلال کی بدترین مثال ہے۔ چنانچہ پروفیسر اسٹارٹ اپنی کتاب "مائنڈ اینڈ میٹر" میں ذہنی صفات کی نیرنگیوں کا اندازہ کرتے ہوئے اس بے ربطی کو' جو مادہ اور ذہنی مظاہر میں ہے' ان الفاظ میں ادا کرتا ہے :

"جہاں کہیں سے بھی ذہن شروع ہوتا ہوا سمجھا جائے وہ اس طرح ناگہانی طور پر نمودار ہوتا ہے جیسے طپنچہ سے گولی جو پہلے سے طپنچہ میں موجود نہ ہو ـــــ ذہن کا مادہ سے پیدا ہونا مادی دنیا میں فطرت کے سارے نظام کے منافی و مناقض ہے۔ یہ گویا عدم سے وجود کی تخلیق کے معجزے کا قائل ہونا ہے"۔

(و) اس کائنات کی تخلیق کے بارے میں "The Big Bang Theory" بھی ایک نامعقول ' غیر منطقی' غیر سائنسی اور خیالی اِدعا ہے۔ یہی حال "The Steady State Theory" کا بھی ہے۔ George Lamaitre نے 1931ء میں یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ 18000 ملین سال قبل ایک کائناتی بیضے کے دھماکے سے پھٹنے سے اس کائنات کا آغاز ہوا۔ تمام کہکشائیں' جو آج نظر آ رہی ہیں' اسی دھماکے کے ریزے ہیں۔ یہ کائناتی انڈا کہاں سے آیا اور کیسے وجود پذیر ہوا؟ اس کا کوئی معقول جواب نہ تو جارج لیمیٹر دے سکے اور نہ سائنس کبھی دے سکتی ہے۔ کیونکہ کائنات کے آغاز تک مشاہدے کی رسائی ہے ہی نہیں۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ایک کائناتی بیضہ آج سے 18000 ملین سال قبل دھماکے سے پھٹا ہو گا تو بھی ہمارا مشاہدہ اور تجربہ تو یہ ہے کہ

دھماکے سے پھٹنے والے مادے میں نہ نظم ہوتا ہے نہ ضبط۔ بلکہ اس سے ایک بے ربطی اور ہنگامہ رو پذیر ہوتا ہے' انتشار اور انفصال واقع ہوتا ہے۔ پھیلتی ہوئی گیسیں نہایت بے ڈول اور بے ترتیب انداز میں کمترین مزاحمت کا راستہ اختیار کرتی ہیں۔ لیکن یہاں نظم و ضبط کی انتہا ہے' پابندی اوقات بے مثال ہے' تمام اشیاء سائنٹیفک فارمولوں اور ریاضی کے اصولوں کے تحت مصروفِ عمل ہیں۔ اجرامِ فلکی کی تخلیق جو خود سہار قوت کے مالک نہایت منور کروں پر مشتمل ہے' انسانی فہم و ادراک سے ماوراء ہے۔ ان کا حیرت انگیز نظام' پنہائیاں اور فاصلے' پیچیدہ مدار' باہمی کشش وجذب اور طوفان ہائے نور کسی حادثے کا نتیجہ ہرگز نہیں ہو سکتے۔ اس قسم کی سوچ ایک بیمار ذہن کی پیداوار ہے اور ظلم اور ہٹ دھرمی کی انتہا ہے۔ اس کیفیت کو سورۂ یونس کی آیت 39 میں بخوبی واضح کیا گیا ہے :

﴿ بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ ﴾

"انہوں نے بس صرف اس لئے جھٹلا دیا کہ بات ان کی سمجھ میں نہ آئی یا ان کے حواس کی گرفت میں نہ آسکی اور ابھی اس کی حقیقت ان پر کھلی نہیں۔"

(ز) اس کے مقابلے میں وحی اور نبوت والوں کا ارشاد ہے کہ وجود' زندگی' علم' ارادہ' ادراک و شعور' قوت و قدرت وغیرہ صفات' جنہیں انسان وجود کا کمال سمجھتا ہے یا کمال سمجھ سکتا ہے' کائنات کا بنیادی وجود ان تمام صفاتِ کمال سے ازلاً یعنی ہمیشہ سے موصوف ہے۔ یعنی ہمارے سامنے "نابود" کی "نمود" اور "بود" ہو رہی ہے۔ جو نہ تھا وہ نہیں ہوا بلکہ جو تھا وہی ہوا اور ہو رہا ہے۔ اب آپ غور فرمایئے کہ کیا عقل کے لئے اس کا ماننا آسان ہے یا اس کا کہ جو نہ تھا وہی ہوا اور ہو رہا ہے۔

حقیقت دراصل یہ ہے کہ الحاد اور دہریت کا مرتکب وہی شخص ہو سکتا ہے جس نے عقل اور فطرت دونوں برباد کر لئے ہوں۔

قرآن تحقیق کی دعوت دیتا ہے

قرآن مجید کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت مبرہن ہو کر سامنے آتی ہے کہ قرآن تحقیقات کی کھلی دعوت دیتا ہے۔ مثلاً سورۃ العنکبوت میں ارشاد ہے :

﴿ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ... ﴾ (آیت 20)

"ان سے کہو کہ زمین میں چلیں پھریں اور دیکھیں کہ اللہ نے کس طرح مخلوق کو پیدا کیا (یعنی کس طرح عالم کی ابتداء کی)"۔

اور سورۂ یونس میں ارشاد ہے :

﴿ قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ (آیت 101)

"آپ فرما دیجئے کہ وہ دیکھیں کہ کیا کیا چیزیں آسمانوں اور زمین کے بیچ میں ہیں۔"

اسی طرح سورۃ الانبیاء کی آیت 30 میں ارشاد ربانی ہے :

﴿ اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ﴾

"کیا ان منکرین نے نہیں دیکھا کہ آسمان و زمین باہم ملے ہوئے تھے' پھر ہم نے ان کو جدا کیا۔"

کیا یہ منکرین' جو تخلیق کائنات کو ایک قدیم حادثہ قرار دیتے ہیں' ہماری طرح یہ یقین کرنے والے تھے کہ آسمان اور زمین شروع میں باہم ملے ہوئے تھے اور بعد میں جدا کئے گئے؟ 1920ء تک کسی کو اس حقیقت کا علم نہ تھا۔ بعد ازاں جب بڑی بڑی دُوربینیں بنیں تو تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا کہ ساری کائنات شروع میں یکجا تھی' بعد میں الگ کر دی گئی اور سورج اور ستاروں میں منقسم ہو گئی۔ گویا اس آیت کی صداقت دُوربینوں کی ایجاد کے بعد واضح ہو گئی۔ اسی طرح سورۂ ق میں ارشاد باری ہے۔

﴿ اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ○ وَّالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ○ تَبْصِرَةً وَّ ذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ○ ﴾ (آیات 6'7'8)

"کیا ان لوگوں نے آسمان کی طرف نہیں دیکھا کہ ہم نے اس کو کیسے بنایا اور مزین کیا اور اس میں کوئی خامی نہیں۔ اور زمین کو ہم نے پھیلایا اور اس میں پہاڑوں کو جمایا اور اس میں ہر قسم کی خوشنما چیزیں اُگائیں جو آنکھوں کو کھولنے والی اور سبق آموز ہیں ہر رجوع کرنے والے بندے کے لئے۔"

اب ذرا غور فرمایئے کہ ان آیات میں الفاظ فَانْظُرُوْا' اُنْظُرُوْا' اَوَلَمْ يَرَ اور يَنْظُرُوْا سے

کیا صرف آنکھوں سے دیکھنا ہی مطلوب ہے یا کچھ اور؟ دیکھنے کو تو ہم جب سے پیدا ہوئے ہیں آسمان کی طرف نگاہیں دوڑاتے ہی رہتے ہیں۔ شہروں کے آلودہ ماحول میں کچھ ٹمٹماتے ہوئے ستاروں پر ہماری نظر پڑتی ہے۔ پہاڑوں کی بلندیوں پر، جہاں فضا شہروں کی طرح مکدر نہیں ہوتی، بہت زیادہ تعداد میں ٹمٹماتے ہوئے ستارے نہایت خوشنما اور دل کو لبھانے والا منظر پیش کرتے ہیں۔ ہم اس منظر کو دیکھ کر قدرت کی حیرت انگیزیوں اور کرشمہ سازیوں کا اقرار کرتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ سپاس گزاری کے انداز میں قدرت کی کاریگری کی مدح سرائی کرتے ہیں۔ کیا ہمارے ان اتفاقی مشاہدوں سے ہمیں کچھ اور بھی حاصل ہوتا ہے؟ قرآن حکیم میں اکثر مقامات پر ایسی نصوص پائی جاتی ہیں جن میں مسلمانوں کو تحصیل علم کے ساتھ زمین و آسمان کی تخلیق، کواکب و اجرامِ فلکیہ کے نظامات، دن اور رات کے اُلٹ پھیر، ہواؤں کے تغیرات، سمندروں کے عجائبات، مختلف عناصر اور متفرق قویٰ کے امتزاج سے انسان کی حیرت انگیز تخلیق، پھر اسے عقل و شعور اور تفکر و تدبر کی صلاحیت عطا کر کے دوسری مخلوق پر واضح فوقیت و فضیلت عطا فرمانا اور پھر جمادات، نباتات اور حیوانات کو اس کی خدمت کے لئے مسخر کئے جانے کے بارے میں غور و فکر کی ہدایت دی گئی ہے۔ قرآن ہی انسان کو تسخیر کائنات کے حوصلے عطا کرتا ہے۔ دوسرے علوم خاص طور پر سائنس کو قرآن حکیم کے فہم کا ذریعہ سمجھ کر سیکھنا اور پڑھنا خود قرآن مجید سے ثابت ہے۔ چنانچہ حم السجدہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

﴿ سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ﴾ (آیت 53)

"ہم اپنی نشانیاں ان کو آفاق میں (یعنی ان کے اپنے ماحول میں) بھی دکھائیں گے اور خود ان کے نفس میں بھی حتیٰ کہ یہ بات ان پر بالکل واضح ہو جائے گی کہ یہ قرآن سراسر حق ہے"۔

بہرحال ایک بندۂ مومن کے لئے لازم ہے کہ وہ یہ حقیقت خوب اچھی طرح سے سمجھ لے کہ منبع ہدایت صرف قرآن مجید ہے اور نبی کریم ﷺ کی تنبیہ ہمیشہ اس کے پیش نظر رہنی چاہئے کہ ((وَمَنِ ابْتَغَى الْهُدٰى مِنْ غَيْرِهٖ اَضَلَّهُ اللّٰهُ)) "جو شخص قرآن کو چھوڑ کر کہیں اور سے ہدایت تلاش کرے گا اللہ اسے لازماً گمراہ کر دے گا"۔

مسلمانوں کا علمی عروج

قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے قرآن حکیم کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کے تخلیقی کارناموں سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے تحقیقات کا آغاز کیا۔ پہلے انہوں نے فلکیاتی مشتملات سے آگاہی حاصل کرنے کے لئے رصد گاہیں قائم کیں اور چونکہ فلکیاتی تحقیقات کا انحصار سائنٹیفک علوم کی فراوانی پر ہے' لہٰذا انہوں نے طبیعیاتی اور حیاتیاتی علوم اور ریاضی میں بھی تحقیقات شروع کیں اور نتیجتاً کئی متعلقہ علوم کو جنم دیا۔ مثلاً الجبرا' جیومیٹری' علمِ کیمیا' علمِ طبقات الارض اور علمِ موسمیات وغیرہ۔ ان کے علاوہ طب میں قابلِ صد افتخار کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ ہمارے اسلاف کی علمی تحقیقات' سائنسی ایجادات' ادبی تصنیفات اور صنعت و حرفت کے میدان میں غیر معمولی کارنامے ہمارے لئے سبق آموز بھی ہیں اور عبرت انگیز بھی۔ اپنے بزرگوں کی بیش قیمت تصنیفات کو یورپ کی لائبریریوں میں دیکھ کر علامہ اقبال کے قلبِ حساس کے احساسات یہ تھے ؎

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آباء کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

عربوں کی علمی ترقی کے بارے میں مؤرخین کی رائے

(1) فلپ کے ہٹی History of the Arabs میں لکھتا ہے کہ علمِ فلکیات میں عربوں نے کافی ترقی کی تھی۔ انہوں نے جن ستاروں اور constallations کی تحقیقات کی تھیں ان کے عربی نام رکھے۔ علمِ ریاضی میں صفر(zero) کا گراں قدر اضافہ کرکے اس کو اس مقام پر پہنچادیا کہ آج ساری دنیا حساب اور گنتی میں اسی پر عمل پیرا ہے۔ انہوں نے پیشۂ طب کے معیار کو اتنا بلند کیا کہ اس پیشہ کو اختیار کرنے کے لئے خلیفہ مامون الرشید کے زمانے سے ہی اطباء کو حکومت کا مقرر کردہ امتحان پاس کرکے سند حاصل کرنا پڑتی تھی۔ چنانچہ صرف بغداد میں اس وقت بھی تقریباً 860 سند یافتہ ڈاکٹر تھے۔

(2) ڈریپر لکھتا ہے کہ عرب ہر معاملہ میں جستجو اور تحقیق کرنے کے عادی تھے۔ علمِ فلکیات میں انہوں نے جو ترقی کی اس کی مثال نہیں ملتی۔ انہوں نے رصد گاہیں

بنائیں، تحقیقات کرنے کے لئے فلکی آلات استعمال کئے، اصطرلاب اور ربع دائرہ بنایا، ستاروں کے نقشے بنائے، زمین کا قطر اور حجم معلوم کیا، سورج گرہن اور چاند گرہن کے اوقات کا تعین کیا، سال کا صحیح وقت معلوم کیا، ریاضی میں ہندسوں کے استعمال کا طریقہ ایجاد کیا۔ دنیا کو الجبرا اور جیومیٹری سکھائی۔ علمِ کیمیا انہی کی ایجاد ہے۔ گندھک اور چاندی کے ترشے بنائے، الکوحل دریافت کیا، مرکب بنانے کے طریقے ایجاد کئے۔ ان کی تجربہ گاہیں عصری آلات سے مزین تھیں۔ طبیعیات میں انہوں نے کافی ترقی کی، قانونِ جذب و کشش دریافت کیا، نقل و حرکت، پُلی اور لیور کے فوائد معلوم کئے، سیال اور ٹھوس چیزوں کے وزن معلوم کرنے کا طریقہ دریافت کیا، شعاعِ مخنی کے راستوں کا تعین کیا، مرکب دواؤں کے استعمال کا طریقہ ایجاد کیا۔ علمِ بصریات میں سابقہ نظریات کو غلط ثابت کر کے صحیح اصول بنائے، الغرض انہوں نے وہ سب کچھ ایجاد کیا جس کو ہم اب اپنی ایجاد سمجھتے ہیں۔

(3) پنڈت جواہر لال نہرو، اپنی کتاب Glimpses of the World History میں لکھتا ہے کہ عربوں سے پہلے مصر، چین اور ہندوستان میں کوئی سائنٹیفک علم نہیں تھا۔ بالکل معمولی علم یونان میں پایا جاتا تھا۔ روم میں تو بالکل مفقود تھا۔ مگر عربوں نے سائنٹیفک علوم کی بنیاد ڈالی اور وہ Father of Modern Science کہلانے کے مستحق ہیں۔

مسلمانوں کی علمی ترقی کے خلاف سازشیں :

مسلمانوں کی اس حیرت انگیز علمی ترقی سے یہودی اور عیسائی راہب بہت خائف تھے، کیونکہ انہوں نے بھانپ لیا تھا کہ مسلمانوں کی اس علمی ترقی سے ان کی تحریفات کا بھانڈا پھوٹ جائے گا اور ان کے تحریف کردہ مذہبی نظریات غلط ثابت ہو جائیں گے۔ لہٰذا وہ گھناؤنی اور منظم سازش کے تحت مسلمان علماء کے بھیس میں مسلمانوں میں یہ پروپیگنڈا کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ علمی تحقیقات قرآنی نظریات کے خلاف ہیں، اس لئے مسلمانوں کو علمی تحقیقات سے گریز کرنا چاہیئے۔ چنانچہ مسلمان گیارھویں اور بارھویں

صدی عیسوی کے دوران تحقیقات تو کجا علم ہی سے دُور ہو گئے اور رفتہ رفتہ ملائیت کے بحر زخار میں ڈبو دیئے گئے، جہاں وہ اب تک ڈبکیاں کھا رہے ہیں اور نکلنے کا راستہ نہیں پا رہے۔ بقول عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ

وَمَا اَفْسَدَ الدِّيْنَ اِلَّا الْمُلُوْكُ
وَاَحْبَارُ سَوْءٍ وَرُهْبَانُهَا

"اور دین کو نہیں برباد کیا مگر بادشاہوں نے اور ملاؤں نے اور پیشہ ور راہبوں نے" ـــــ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ!

یہ مقالہ Institute of Floriculture Department of food and Agriculture Lahore میں پڑھا گیا۔

کتب حوالہ

1) قرآن مجید
2) معارف الحدیث، مولانا محمد منظور نعمانی
3) الدین القیم، سید مناظر احسن گیلانی
4) اللہ کی عظمتیں، عزیز احمد
5) مظاہر الحق جدید، شرح مشکوٰۃ شریف، از افادات علامہ نواب محمد قطب الدین خان دہلوی
6 *Stars and Planets by Ian Ridpeth*
7 *Elements of Nuclear Engineering by Glenn Murphy*

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

امام ابو نعیم اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ

عبدالرشید عراقی

امام ابو نعیم اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ بلند پایہ محدث، مؤرخ اور صاحب کمال صوفی تھے۔ ان کے علمی تبحر کا اعتراف اہل سیر نے کیا ہے۔ اپنے علمی کمالات کی وجہ سے ان کی ذات مرجع خلائق تھی۔ ان کی ساری زندگی درس و تدریس میں بسر ہوئی۔ لوگ دور دراز سے سفر کر کے ان کی مجلس درس میں شریک ہوتے اور ان سے استفادہ کرتے۔ ہر وقت طلبہ کا ایک جم غفیر ان کے درس میں موجود رہتا۔ اہل سیر نے ان کی مجلس درس کا ذکر اپنی کتابوں میں کیا ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں :

"جب ان کی مجلس درس آراستہ ہوتی تو اربابِ فن اور محدثین عجز و نیاز کے ساتھ ان کے دولت کدہ پر حاضر ہو کر بڑی رغبت اور مکمل انہماک کے ساتھ اکتسابِ فیض کرتے تھے کیونکہ ان کے علوِ اسناد، جودتِ حفظ و ضبط اور وفورِ علم کا چرچا تھا"۔ (۱)

درس کا سلسلہ صبح سے ظہر تک جاری رہتا۔ ظہر کے بعد جب امام ابو نعیمؒ گھر تشریف لے جاتے تو راستہ میں بھی شائقین ان سے استفادہ کرتے تھے۔ حافظ ذہبیؒ فرماتے ہیں :

لم یکن له غذاء سوی التسمیع والتصنیف (۲)

"حدیثیں سننا سنانا اور ان کی جمع و تالیف ہی ان کی غذا تھی"۔

نام و نسب و ولادت اور خاندان : امام ابو نعیمؒ کا نام احمد بن عبداللہ بن احمد بن اسحاق بن موسیٰ بن وائل بن مہران ہے۔ ۳۳۶ھ ان کا سن ولادت ہے۔ ان کے جد اعلیٰ مہران کو سب سے پہلے مسلمان ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اور وہ عبداللہ بن معاویہ بن عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب کے مولیٰ تھے۔ ابو نعیم کے والد عبداللہ بن احمد علم و فن کے دلدادہ تھے۔ اور ان کے نانا محمد بن یوسف مشہور صوفی اور زاہد تھے۔

اساتذہ : امام ابو نعیم اصفہانیؒ کے اساتذہ کی فہرست طویل ہے۔ اربابِ سیر نے اس

کی تصریح کی ہے کہ آپ نے بے شمار علمائے فن سے استفادہ کیا۔ حافظ ذہبی لکھتے ہیں :

"انہوں نے خراسان و عراق کے بے شمار لوگوں سے کسب فیض کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کو جس قدر اکابر شیوخ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا اس سے دیگر محدثین محروم ہیں"۔ (۳)

تلامذہ اساتذہ کی طرح ان کے تلامذہ کی فہرست بھی طویل ہے۔ ان سے بے شمار لوگوں نے اکتسابِ فیض کیا۔ حافظ ابنِ سبکی اور حافظ ذہبی نے اپنی اپنی کتابوں میں ان کے تلامذہ کی فہرست درج کی ہے۔ امام ابو بکر خطیب بغدادی صاحب تاریخ بغداد ان کے خاص تلامذہ میں سے تھے۔ (۴)

علم و فضل : امام ابو نعیمؒ کے علم و فضل، علمی تبحر اور صاحب کمال ہونے کا ائمہ فن اور اربابِ سیر نے اعتراف کیا ہے اور ان کو الحافظ الکبیر، الحافظ المشہور اور من اکابر الحافظ الثقات کے القابات سے یاد کیا ہے۔ ان کے حفظ و ضبط، عدالت و ثقافت اور حذق و اتقان پر تذکرہ نگاروں کا اتفاق ہے۔ حافظ ابنِ سبکی نے لکھا ہے کہ ابو نعیمؒ مرتبہ کمال پر فائز تھے اور حافظ ذہبی نے بھی ان کے حفظ و ضبط کا اعتراف کیا ہے۔ (۵) حدیث میں ان کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ اہل سیر نے ان کو محدث العصر اور من اعلام المحدثین والرواۃ کے لقب سے موسوم کیا ہے۔ علامہ ابنِ سبکی فرماتے ہیں کہ :

"ابو نعیم ان ممتاز لوگوں میں تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے روایت میں علو کے ساتھ درایت میں بھی حد کمال پر فائز کیا تھا۔" (۶)

حافظ ذہبی کہتے ہیں کہ :

"حافظ ابو نعیم علوِ اسناد، حفظ و ضبط اور جملہ علوم و فنون حدیث میں تبحر کے لحاظ سے پوری دنیا میں ممتاز تھے"۔ (۷)

حافظ ابنِ عساکر فرماتے ہیں کہ :

"ابو نعیم جمع و معرفت حدیث میں یکتا اور فضائل و کمالات کا مجموعہ تھے"۔ (۸)

فقہ و تصوف میں بھی جامع کمال تھے۔ تصوف و سلوک سے ان کی دلچسپی خاندانی تھی۔ ان کے نانا محمد بن یوسف کا شمار مشہور اہل اللہ اور صوفیاء میں ہوتا تھا۔ اور تصوف میں ان کے صاحب کمال ہونے کا ثبوت ان کی شہرہ آفاق کتاب حلیۃ الاولیاء سے ملتا ہے۔ (۹)

فقہی مذہب : فقہ میں امام شافعی کے مذہب سے وابستہ تھے۔[۱۰]

عقیدہ : عقائد میں اشاعرہ کے ہمنوا تھے۔ حافظ ابنِ عساکر نے تبیین کذب المفتری میں اس کی تصریح کی ہے[۱۱] اور حافظ ابنِ جوزی نے بھی لکھا ہے کہ ابو نعیم اشعری مذہب کی جانب شدید میلان رکھتے تھے۔[۱۲]

اشعری مذہب کی طرف زیادہ میلان ہونے کی وجہ سے امام ابو نعیم شدائد و محن سے بھی دوچار ہوئے۔ ان کے دور میں حنابلہ کا زور و اثر بہت بڑھ گیا تھا' جس کی وجہ سے ان کے خلاف شورش و ہنگامہ برپا ہوا اور جامع مسجد میں ان کا داخلہ ممنوع کر دیا گیا۔ علامہ ابنِ خلکان لکھتے ہیں کہ :

> "حنابلہ کی شدت پسندی کے علاوہ اس کا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ابو نعیم کے فضل و کمال اور غیر معمولی شہرت و مقبولیت نے ان کی ذات کو محسود و مبغوض بنا دیا ہو۔"[۱۳]

وفات : حافظ ابو نعیم نے ۹۴ سال کی عمر میں محرم الحرام ۴۳۰ھ میں انتقال کیا۔[۱۴]

تصانیف : حافظ ابو نعیم صاحب تصانیف کثیرہ تھے اور ان کی تصانیف بلند مرتبہ تھیں۔ اہل سیر نے ان کی تصانیف کی تعریف و توصیف کی ہے۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے ان کی ۲۹ کتابوں کے نام لکھے ہیں' جن میں ۲۷ غیر مطبوعہ اور ۲ مطبوعہ ہیں۔[۱۵]

غیر مطبوعہ تصانیف میں درج ذیل کتابیں اپنے موضوع کے اعتبار سے بلند مرتبہ کی حامل ہیں:

(۱) کتاب الاربعین (۲) الطب النبوی (۳) کتاب الفوائد (۴) کتاب المستخرج علی البخاری (۵) کتاب معجم الصحابہ (حافظ ابنِ کثیر کے پاس اس کا ایک نسخہ مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا موجود تھا)[۱۶] (۶) کتاب علوم الحدیث (امام حاکم کی مشہور کتاب معرفۃ علوم الحدیث پر مستخرج ہے) (۷) کتاب المستخرج علی التوحید (امام ابنِ خزیمہ کی کتاب التوحید والصفات پر مستخرج ہے) (۸) تاریخ اصفہان

مطبوعہ تصانیف دلائل النبوۃ اور حلیۃ الاولیاء و طبقات الاصفیاء ہیں۔ ان دونوں کتابوں کا مختصر تعارف درج ذیل ہے۔

☆ **دلائل النبوۃ** : یہ کتاب آنحضرت ﷺ کے خصائص و کمالات' فضائل و مکارم

اور دلائل نبوت اور معجزات سے متعلق ہے۔ پہلے قرآن مجید کی روشنی میں آنحضرت ﷺ کے اوصاف و کمالات بیان کئے گئے ہیں اور تائید میں روایات پیش کی گئی ہیں۔ اس کے بعد قدیم کتابوں اور صحف انبیاء میں آپؐ کے بارے میں جو پیشین گوئیاں آئی ہیں' ان کو ذکر کیا گیا ہے۔ ابو نعیم نے اس کتاب میں ضعیف روایات کا بھی سہارا لیا ہے۔ تاہم اس کا شمار معتبر کتابوں میں ہوتا ہے۔ دلائل کا پہلا ایڈیشن ۱۳۳۰ھ میں اور دوسرا ۱۳۶۹ھ میں دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدر آباد دکن سے شائع ہوا۔ اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

☆ حلیۃ الاولیاء وطبقات الاصفیاء : یہ حافظ ابو نعیم کی بہترین اور عمدہ کتاب ہے۔ مصنف نے اس میں ان صحابہ کرام' تابعین عظام' تبع تابعین اور مابعد ائمہ علام و متقین کا ذکر کیا ہے۔ جو زہد و ورع اور معرفت و تصوف میں ممتاز اور صاحب کمال تھے۔

اہل سیر نے اس کتاب کی تعریف و توصیف کی ہے۔ علامہ ابنِ خلکان اور صاحب کشف الظنون نے اس کو عمدہ اور معتبر کتاب بتایا ہے۔[۱۷] حافظ ابنِ کثیر فرماتے ہیں :

"اس کتاب کے مطالعہ سے مصنف کی وسعت نظر' ان کے شیوخ کی کثرت اور مخارج و طرق حدیث سے پوری واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے"[۱۸]

حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ

"حافظ ابو نعیم کی بہترین اور عمدہ کتاب ہے اور مصنف کی زندگی ہی میں اس کو پوری شہرت اور غیر معمولی حسن قبول و اعتبار حاصل ہو گیا تھا۔"[۱۹]

حضرت شاہ عبد العزیز فرماتے ہیں کہ

"اسلامیات میں ایسی نادر اور بے مثال کتاب نہیں لکھی گئی۔"[۲۰]

محمد بن جعفر کتانی لکھتے ہیں کہ

"اس کتاب میں امام ابو حنیفہؒ کا تذکرہ شامل نہ کئے جانے کی وجہ سے حافظ ابو نعیم پر تعصب کا الزام عائد کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں اس کتاب میں صحیح' ضعیف اور بعض موضوع روایات کو بھی شامل کیا گیا ہے۔"[۲۱]

حواشی :

(۱) شاہ عبد العزیز دہلوی' بستان المحدثین' ص ۴۴ (۲) ابنِ خلکان' تاریخ ابنِ خلکان ج ۱' ص ۴۵

(۳) ذہبی' تذکرۃ الحفاظ' ج ۳' ص ۲۹۲

(۴) ابنِ سبکی 'طبقات الشافعیہ' ج ۳' ص ۸۔ ذہبی 'تذکرۃ الحفاظ' ج ۳' ص ۲۹۲

(۵) ابنِ سبکی 'طبقات الشافعیہ' ج ۳' ص ۸۔ ذہبی 'تذکرۃ الحفاظ' ج ۳' ص ۲۹۱

(۶) ابنِ سبکی 'طبقات الشافعیہ ج ۳' ص ۸

(۷) ذہبی 'تذکرۃ الحفاظ ج ۳' ص ۲۹۱

(۸) ابنِ عساکر' تبیین کذب المفتری' ص ۲۴۶

(۹) ابنِ سبکی 'طبقات الشافعیہ' ج ۳' ص ۸۔

(۱۰) ابنِ سبکی 'طبقات الشافعیہ' ج ۳' ص ۸

(۱۱) ابنِ عساکر' تبیین کذب المفتری' ص ۲۴۶

(۱۲) ابنِ جوزی 'المنتظم' ج ۸' ص ۱۰۰

(۱۳) ابنِ خلکان 'تاریخ ابنِ خلکان ج ۱' ص ۴۵

(۱۴) ابنِ جوزی 'المنتظم' ج ۸' ص ۱۰۰

(۱۵) ضیاء الدین اصلاحی 'تذکرۃ المحدثین' ج ۲' ص ۲۲۱ تا ۲۲۴

(۱۶) ابنِ کثیر 'البدایہ والنہایہ' ج ۱۲' ص ۴۵

(۱۷) ابنِ خلکان 'تاریخ ابنِ خلکان' ج ۱' ص ۴۵

(۱۸) حافظ ابنِ کثیر 'البدایہ والنہایہ' ج ۱۲' ص ۴۵

(۱۹) ذہبی 'تذکرۃ الحفاظ' ج ۳' ص ۲۹۱

(۲۰) شاہ عبدالعزیز 'بستان المحدثین' ص ۴۴

(۲۱) محمد جعفر کتانی 'الرسالۃ المتطرفہ' ص ۱۱۵

مراحل انقلاب کے نقطہ نگاہ سے سیرتِ مطہرہ کا ایک منفرد مطالعہ

اسلامی انقلاب کیلئے سرگرم عمل افراد کیلئے مشعل راہ

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ' کے گیارہ خطبات پر مشتمل کتاب

منہج انقلابِ نبویؐ

کا نیا ایڈیشن' جو حسن ظاہری ہی نہیں حسن معنوی کے اعتبار سے بھی

سابقہ ایڈیشن پر فوقیت رکھتا ہے' چھپ کر آ گیا ہے

دیدہ زیب کمپیوٹر کمپوزنگ' عمدہ طباعت' چار رنگوں میں شائع شدہ خوبصورت سرورق'

صفحات : 376 قیمت مجلد : 160 روپے ' غیر مجلد : 140 روپے

شائع کردہ : مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن' 36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور

کتابتِ مصاحف اور عِلمِ ضبط (۵)

علاماتِ ضبط کی ابتداء، ان کے متنوع ارتقاء اور ان کے زمانی اور مکانی ممیّزات کا اجمالی جائزہ

—— پروفیسر حافظ احمد یارؒ ——

۴۱۔ تنوین : یہ دراصل حرف متحرک اور نون ساکنہ کا امتزاج ہے جو کسی کلمہ کے آخر پر واقع ہوتا ہے۔ اس میں نون ملفوظی شکل میں موجود مگر مکتوبی شکل میں غائب ہوتا ہے۔ الدانی کے بیان کے مطابق ابو الاسود نے اس کے لئے دو نقطے تجویز کئے تھے جو تنوین رفع کے لئے حرف کے سامنے (پیچھے)، تنوین نصب کے لئے حرف کے اوپر اور تنوین جر کے لئے حرف کے نیچے لگائے جاتے تھے کسی حرف حلقی سے ماقبل یہ نقطے متراکب (:) اور حروف اخفاء سے پہلے متتابع (..) ہوتے تھے۔ (۱۰۱)

☆ الخلیل کے ایجاد کردہ طریقے میں اسے دو دو حرکات سے ظاہر کیا جانے لگا اور اب تک کیا جاتا ہے یعنی (ـً ـٍ ـٌ)۔ البتہ ان حرکات کی ترچھی یا افقی شکل کے رواج کا اثر تنوین کی شکل میں بھی ظاہر ہوتا ہے، مثلاً افقی تنوین یوں ہوتی ہے (ـً، ـٍ، ـٌ) اور خط بہار میں تنوین رفع یوں بھی لکھی جاتی ہے (ـٌـ)۔ عرب اور افریقی ممالک میں تنوین کے نون ملفوظی کے اظہار کیلئے متراکب حرکات (ـً، ـٍ، ـٌ یا ـً، ـٍ، ـٌ) استعمال کی جاتی ہیں اور اخفاء کی صورت میں متتابع حرکات (ـً، ـٍ، ـٌ یا ـً، ـٍ، ـٌ) لکھی جاتی ہیں۔ برصغیر اور ترکی و ایران میں عموماً تنوین میں اخفاء یا اظہار کی تمیز نہیں کی جاتی۔ یہ فرق استاد حرف حلقی کے قاعدے کی صورت میں سمجھا دیتا ہے۔ بہرحال یہ ناقص ضبط ہے۔

☆ تنوین کے نون کے اقلاب بمیم کو ظاہر کرنے کے لئے برصغیر اور چین کے مصاحف میں پوری تنوین لکھنے کے بعد اگلی "ب" پر چھوٹی سی "م" لکھنے کا رواج رہا ہے۔ مثلاً امداً

بعیداً۔ ترکی (اور ایران کے بیشتر) مصاحف میں یہ چھوٹی "م" لکھنے کا مطلقاً رواج نہیں ہے۔ معلوم نہیں وہ اس "ن" کی آواز کو کس طرح "م" میں بدلتے ہیں۔ بظاہر یہ نہایت ناقص ضبط ہے اور قاری کو صحیح تلفظ میں کوئی مدد نہیں دیتا۔ [۱۰۲] عرب اور افریقی ممالک کے مصاحف میں بصورت تنوین اس اقلاب کو ظاہر کرنے کے لئے تنوین کی صرف ایک حرکت لکھ کر ساتھ چھوٹی سی "م" لکھ دی جاتی ہے (ـَـم ـِـم ـُـم)۔ تجویدی قرآن میں یہ چھوٹی "م" پوری تنوین اخفاء کے ساتھ لکھی گئی ہے (ـًـم ـٍـم ـٌـم)۔ یہ طریقہ مصری مصحف سے ہی ماخوذ ہے مگر ذرا ترمیم کے ساتھ' جو کاتبِ مصحف کے لئے مشکل پیدا کرنے والی ہے مگر قاری کے لئے نہایت مفید ہے۔

☆ عرب اور افریقی ممالک میں حرف منون کے بعد حرف مدغم فیہ (بادغامِ تام) ہونے کی صورت میں تنوین اخفاء لکھ کر حرف مدغم فیہ پر علامت تشدید ڈالتے ہیں۔ اور ادغام ناقص کی صورت میں تنوین اخفاء کے بعد اگلے مدغم حرف کو علامت تشدید سے خالی رکھا جاتا ہے۔ اور اس معاملے میں حرف مدغم فیہ کے "و" یا "ی" ہونے کا بھی لحاظ نہیں رکھا جاتا' مثلاً غفوراً رحیماً اور رَحیمٌ وَدُودٌ لکھتے ہیں حالانکہ مؤخر الذکر کلمہ میں ادغام مع الغنہ ہے۔ [۱۰۳] یہ طریقہ عرب اور افریقی ممالک کے علاوہ ترکی اور ایران کے مصاحف کی کتابت میں بھی رائج ہے۔ البتہ برصغیر اور چین میں ادغام ناقص کی صورت میں حرف مدغم فیہ پر علامت تشدید ضرور ڈالی جاتی ہے۔ "تجویدی قرآن مجید" میں ادغام تام کی صورت میں تنوین اخفاء لکھ کر اس کے دوسرے حصے پر باریک سی علامت تنسیخ ڈالی گئی ہے۔ (ـًـ، ـٍـ، ـٌـ) اور ادغام ناقص کی صورت میں تنوین اخفاء کے ساتھ ایک مخصوص علامت سکون (جو غنہ کی علامت ہے) ڈالی گئی ہے (ـًـ، ـٍـ، ـٌـ) اور ہر دو ادغام کے لئے حرفِ مدغم فیہ پر علامت تشدید ڈالی گئی ہے۔

☆ تنوین کے نون ملفوظی اور مابعد کے مشدد یا ساکن حرف کے اتصال کی علامت کے طور پر مشرقی ممالک (خصوصاً ترکی' ایران' برصغیر اور چین) میں حرف منون کے بعد یا تنوین کے نیچے ایک چھوٹا سا "ن" لکھتے ہیں جو اکثر مکسور ہی ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں (برصغیر میں) اس نون کو "نون قطنی" بھی کہتے ہیں۔ "تجویدی قرآن" میں یہ نون تنوین کی

دوسری حرکت کے بدل کے طور پر ایک سرے پر لکھا گیا ہے (سے، بے، میے)۔ یہ عجیب بات ہے کی عرب اور افریقی ممالک کے مصاحف میں اس مقصد کے لئے کوئی علامت استعمال نہیں کی جاتی۔ حالانکہ اصول تجوید میں اس نون اتصال (یا نون قطنی) کے طریق اداء سے بحث کی جاتی ہے۔ (۱۰۴) شاید اہل زبان خود بخود ایسے موقع پر نونِ اتصال کا تلفظ پیدا کر لیتے ہوں۔ مگر اہل مشرق کے لئے اس علامت کے بغیر اسے صحیح پڑھنا ناممکن ہے۔

۴۲۔ **حرکاتِ طویلہ** : یعنی الف ما قبل مفتوح یا "و" ما قبل مضموم یا "ی" ما قبل مکسور۔ جسے دوسرے لفظوں میں مد طبیعی یا مد اصلی بھی کہتے ہیں۔ رسم عثمانی میں ان حرکات کے متعدد اور متنوع مظاہر پائے جاتے ہیں اور ان کی خلافِ قیاس اور متباین کتابت نے علم الضبط کے لئے بھی کئی مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔ مد کی صورت میں یہ حروفِ مد (ا، و، ی) ہمیشہ ساکن ہی ہوتے ہیں اور اُس وقت یہ حرفِ صامت کا نہیں بلکہ حرفِ صائت کا کام دیتے ہیں۔ ان حروف کے بعد ہمزہ یا حرف ساکن کے آنے سے مد کی زیادہ کھینچے جانے والی صورتیں یعنی مد فرعی اور اس کی اقسام پیدا ہوتی ہیں۔ اس صورت میں مقدارِ مد کی بنا پر حرف مد کے اوپر علامتِ مد (~) لکھی جاتی ہے۔ یہ علامت بھی الخلیل کی ایجاد ہے۔ افریقی ملکوں میں اور بعض دفعہ خط بہار کے مصاحف میں یہ علامت اس صورت میں لکھی جاتی ہے (ـــ) یا (ـــ)۔

☆ کتب تجوید میں مد کے طول اور قصر کی بنا پر اس کی کئی اقسام مذکور ہوتی ہیں۔ تاہم عموماً تمام ملکوں میں ہر قسم کی مد کیلئے علامت ایک ہی استعمال ہوتی ہے۔ غالباً صرف برصغیر میں ہی مدِ متصل (~) اور مدِ منفصل (~) کی دو علامتیں مستعمل ہیں۔ بعض ایرانی نسخوں میں بھی مد کی یہ دو علامتیں یعنی چھوٹی مد (~) اور بڑی مد (ـــ) دیکھی گئی ہیں۔

☆ الف تو ہمیشہ ما قبل مفتوح ہوتا ہے اور ممدود ہوتا ہے مگر "و" اور "ی" اگر ما قبل مفتوح ہوں تو اسے لین کہتے ہیں اور اس سے صرف خاص شرائط کے ساتھ مد پیدا ہوتی ہے جسے کتب تجوید میں مدّ اللّین کہتے ہیں۔ لیکن اس کے لئے کوئی علامتِ ضبط مقرر نہیں ہے۔ "و" اور "ی" لینہ ہوں تو ان پر علامت سکون ڈالنے کا رواج ہر جگہ ہے۔ مگر "و" یا "ی" مدہ پر علامت سکون ڈالنے کا رواج نہ افریقی ملکوں میں ہے نہ بلادِ عرب میں، بلکہ

ترکی، ایران اور چین تک یہی طریقہ رائج ہے۔ البتہ صرف برصغیر میں واوِ مدہ اور یائے مدہ پر بھی علامت سکون ڈالتے ہیں۔ مثلاً یُورَثُ اور مِیزَانُ کو یُوْرَثْ اور مِیْزَانْ لکھیں گے۔

☆ نحوی نقطۂ نظر سے، اور الف ماقبل مفتوح پر قیاس کرتے ہوئے شاید برصغیر کا یہ تعامل درست نہ سمجھا جائے لیکن غالباً صوتیاتی اصولوں کے مطابق یہ زیادہ بہتر ہے۔ مثلاً اول تو عرب ممالک کے رائج طریقہ میں اولئک، اُولُو العزم اور اُولی الامر وغیرہ الفاظ میں پڑھنے والے کو التباس پیدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن ملکوں یا علاقوں میں حرف مد ("و" یا "ی") پر علامت سکون ڈالنے کا رواج نہیں ہے وہاں قاری کو غلطی سے بچانے کے لئے مذکورہ قسم کے کلمات میں حرف مد پر حرف زائد کی علامت لکھتے ہیں مثلاً اولئک۔ (۱۰۵) بعض جگہ حرف کے نیچے باریک قلم سے لفظ "قصر" (اولئکِ) لکھ دیتے ہیں (۱۰۶) اور بعض جگہ حرف کے نیچے لفظ "بلا اشباع" لکھتے ہیں (۱۰۷) جب کہ ایران، مصر اور ترکی سے مطبوعہ ایسے مصاحف بھی ملتے ہیں جن میں اس التباس کے دور کرنے کے لئے کوئی علامت وغیرہ نہیں دی گئی۔ (۱۰۸)

☆ دوسرے یہ کہ جب حرف مد کے بعد حرف ساکن آ رہا ہو جس میں حرف ممدود کو آگے ملایا جاتا ہے تو اس صورت میں برصغیر میں حرف مد پر علامت سکون نہیں ڈالتے جس سے قاری کو پتہ چل جاتا ہے کہ مد بلکہ حرفِ مد کا تلفظ ہی ختم ہو گیا۔ لیکن عرب ممالک کے ضبط کے مطابق قاری پہلے تو بادیٔ النظر میں ایسے حرفِ مد کو بصورت مد پڑھے گا، پھر اسے پتہ چلے گا کہ اسے تو آگے ملانا ہے۔ مثلاً لفظ "اُوْتُوْا" برصغیر سے باہر "اُوتُوا" لکھا جاتا ہے۔ اس کے بعد مثلاً "العلم" لکھا جائے تو یہ ہمارے ہاں "أُوْتُو الْعِلْمَ" لکھا جائے گا، مگر دوسرے ملکوں میں یہ "أُوتُوا العِلمَ" لکھا جاتا ہے۔ یہاں "تُ" کو "ل" میں ملانے کا پتہ قاری کو "تُو" یعنی "تُوْ" پڑھ چکنے کے بعد چلتا ہے۔ مگر برصغیر کا قاری تُ اور "ل" کے درمیانی حروف کو علامات سے خالی دیکھ کر سمجھ جاتا ہے کہ ان کا تلفظ ہی نہیں ہو گا۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جب ھُوَ اور ھِیَ میں "و" یا "ی" پر علامت حرکت لگ سکتی ہے تو ھُوْ یا ھِیْ میں علامت سکون کیوں نہ لگے؟

۴۳۔ مد کے ہی مسائل میں محذوف (مگر ملفوظ) حرف مد کے ضبط کا مسئلہ آتا ہے۔ عموماً تو یہ محذوف "الف" ہوتا ہے مثلاً "رحمن" میں "م" اور "ن" کے درمیان الف محذوف ہے اور قرآن کریم میں اس کی بیسیوں مثالیں ملتی ہیں۔ کبھی کبھار یہ محذوف "و" یا "ی" بھی ہوتی ہے مثلاً "داود" میں ایک "و" اور "اُمِیّنَ" میں ایک "ی" محذوف ہے۔ قلمی دور میں یہ محذوف (ا' و' ی) سرخ سیاہی سے باریک قلم کے ساتھ لکھ دی جاتی تھی اور اسے ماقبل کی حرکت کے مطابق پڑھ لیا جاتا تھا۔ دور طباعت میں عرب اور افریقی ممالک میں یہ مخذوف (ا' و' ی) باریک قلم کے ساتھ (متن کی ہی سیاہی سے) لکھ دیئے جاتے ہیں اور ماقبل کی حرکت (فتحہ' ضمہ یا کسرہ) بھی لکھتے ہیں مثلاً الرحمٰن' داوٗد اور اُمِیّٖنَ لکھیں گے۔ مگر برصغیر میں "ـَا" کی جگہ "ـٰ" "ـُو" کی جگہ "ـٗ" اور "ی" کی جگہ "ـٖ" لکھا جاتا ہے اور اس طرح یہ لفظ الرحمٰن' داوٗد اور اُمِیّٖنَ لکھے جاتے ہیں۔ عرب ممالک کے مصاحف میں سے صرف مصحف الحلبی میں ان مشرقی علامات کو اختیار کیا گیا ہے۔ (۱۰۹) ترکی اور ایران میں کھڑی زبر "ـٰ" اور کھڑی زیر "ـٖ" کا استعمال کہیں کہیں ملتا ہے مگر ضمہ معکوس یا الٹی پیش "ـٗ" کا استعمال ان ملکوں میں مفقود ہے۔

☆ عرب اور افریقی ملکوں میں کھڑی زبر "ـٰ" محذوف الف مدہ کے لئے استعمال ہوتی چلی آئی ہے اور وہ بھی ماقبل پر فتحہ لگا کر مگر کھڑی زیر "ـٖ" اور اُلٹا پیش "ـٗ" ان ملکوں میں کبھی رائج نہیں ہوا' ماسوائے مصر کے مصحف حلبی کے۔ اس کے برعکس ترکی اور ایران میں الف مدہ سے قبل حرف ممدود کے اوپر کھڑی زبر "ـٰ" اور یائے مدہ سے ماقبل حرف ممدود کے نیچے کھڑی زیر "ـٖ" لکھتے ہیں اور دونوں صورتوں میں حرف ممدود کو حرکت (ـَ یا ـِ) سے اور حرفِ مد (علت) کو علامت سکون سے خالی رکھا جاتا ہے (مثلاً فٰا' فٖی)۔ ضمہ معکوس یا الٹے پیش کا وہاں بھی رواج ہی نہیں ہے۔

☆ اسی مد کے ضمن میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ضمیر واحد مذکر غائب مجرور یا منصوب کی "ہ" (جسے اصطلاحاً ہائے کنایہ بھی کہتے ہیں) کبھی ھُوْ (ہٗ) اور کبھی ھِیْ (ہٖ) کے تلفظ سے بھی پڑھی جاتی ہے۔ ایسی صورتوں میں عرب اور افریقی ممالک میں "ہ" کے نیچے یا اوپر مطلق کسرہ (ـِ) یا ضمہ (ـُ) لکھ کر ساتھ ایک باریک سی "ے" یا "و" لکھ دیتے

ہیں(رسولِہٖ، رسولُہٗ)۔

برصغیر میں ایسے موقع پر "ہ" کے نیچے کھڑی زیر "ٖ" یا اس کے اوپر الٹی پیش (ٗ) لکھتے ہیں(رسولہٖ یا رسولہٗ)۔

☆ عجیب بات ہے کہ ایران میں اس قسم کی ضمیر کے لئے نہ تو کھڑی زیر (ٖ) کا رواج ہے نہ الٹی پیش (ٗ) کا۔ وہاں "ہ" پر صرف کسرہ یا ضمہ لکھ دیتے ہیں (مثلاً رسولِہِ رسولُہُ)۔ نہ تو وہ عرب ممالک کی طرح اس کے ساتھ چھوٹی "ے" یا "و" لکھتے ہیں اور نہ ہی برصغیر کی طرح کھڑی زیر (ٖ) یا ضمہ مقلوبہ (ٗ) کو استعمال کرتے ہیں۔ چین میں بھی دورِ طباعت کے نمونوں میں تو یہی ایران والا طریقہ نظر آتا ہے۔ [قلمی دور کے چینی مصاحف میں اس موقع پر ھائے مکسورہ کے نیچے دو سرخ نقطے (..) اور ھائے مضمومہ کے بعد سرخ "و" لکھتے تھے۔ مثلاً رسولِہٖ اور رسولُہُ و] ترکی میں اس قسم کے ضبط کے لئے کھڑی زیر (ٖ) کا رواج تو ہے مگر پیش کی صورت میں ضمہ مقلوبہ کا رواج قطعاً نہیں۔ مثلاً ترکی مصاحف میں یہ الفاظ آپ کو یوں لکھے ملیں گے (رسولِہٖ رسولُہُ)۔ (۱۱۰)

☆ قراءت کے نقطۂ نظر سے ان ملکوں (یعنی ترکی، ایران اور چین) کا یہ طریق ضبط بہت ناقص ہے کیونکہ اس میں قاری کو مد پر متنبہ کرنے والی کوئی علامت نہیں ہوتی۔ عرب ممالک اور برصغیر کے مصاحف میں علامت مد ضرور ہوتی ہے اگرچہ اس کے ظاہر کرنے کا طریقہ مختلف ہے۔ برصغیر کے طریقے کی مزید خوبی یہ ہے کہ اس میں دو دو علامات (ـِـے یا ـُـو) کی بجائے صرف ایک ایک علامت (ٖ یا ٗ) سے کام لیا جاتا ہے جو کتابت میں وقت کی بچت کا باعث بنتا ہے۔

(جاری ہے)

حواشی

۱۰۱۔ المقنع ص ۱۲۷، المحکم ص ۶۸

۱۰۲۔ ایرانی اور خصوصاً ترکی مصاحف میں تنوین کی طرح عام نون ساکنہ کے بعد بھی "ب" کی وجہ سے اقلاب بمیم کے لئے کوئی علامت استعمال نہیں ہوتی ہے مثلاً وہ من بعدہ اور "امداً بعیداً" ہی لکھتے ہیں۔ اور یہ ان مصاحف کے ضبط کا عیب ہے۔

۱۰۳۔ یہ طریقہ عرب اور افریقی ممالک کے مصاحف کے علاوہ ترکی اور ایران میں بھی رائج ہے۔ قاعدہ

(باقی صفحہ ۹۵ پر)

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے عمرانی نظریات اور دورِ جدید کے مسائل

——— نفیسہ رحمٰن ———

یہ کہنا تو شاید مبالغہ آرائی کے ضمن میں آئے گا کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے عمرانی نظریات آج کے دور کے تمام تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔ اس لئے کہ شاہ صاحب کا زمانہ آج سے تین صدی قبل کا زمانہ ہے جب مشینی انقلاب ابھی رونما نہیں ہوا تھا۔ اُس دور سے لے کر آج تک دُنیا میں بے شمار انقلاب آئے ہیں ——— لیکن شاہ صاحب کی تحقیقات، تحریرات اور نظریات کے بارے میں ایک بات بلا تردد کہی جا سکتی ہے کہ آپ کے یہاں اجتماعی زندگی سے متعلق تمام لوازمات پر مکمل بحث ملتی ہے اور آپ کی تحقیقات آج بھی اجتماعی زندگی کے علوم کے لئے بنیاد کا کام دیتی ہیں۔ ہمیں چاہئے کہ ہم شاہ صاحب کے اجتماعی علوم کو بنیاد بنا کر یورپ کی ترقی یافتہ تحقیق سے فائدہ اٹھائیں تاکہ ہماری اجتماعی زندگی جدیدیت کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ دین اسلام کے اصولوں کی بھی بھرپور عکاس ہو۔ آج ہم مسلمانانِ پاکستان شاہ صاحب کی حکمت کو اساس بنا کر اپنا شاندار مستقبل تعمیر کر سکتے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی تاریخ پیدائش ۲۱/ فروری ۱۷۰۳ء ہے۔ یہ وہ دور ہے جب اورنگ زیب عالمگیر کی حکومت ختم ہو چکی تھی اور مغل حکومت کی جڑیں کھوکھلی کی جا رہی تھیں۔ برصغیر میں مسلم حکومت سکھوں کی بغاوت، مرہٹوں کی چیرہ دستیوں اور نادر شاہ کے حملے [1] کا شکار تھی۔ مسلمانوں کے عقائد، علوم، اخلاق، تمدن اور سیاست کو سخت خطرہ لاحق تھا۔ مسلمانوں میں غیر اسلامی رسومات عام تھیں۔ اس تاریک دور میں جب ہر سمت افراتفری کا سماں تھا تو شاہ صاحب کی تعلیمات نور کا مینار ثابت ہوئیں اور آپ کے مربوط نظریات و خیالات اُس دور کے مسلمانوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوئے۔ شاہ صاحب نے قرآن کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ احادیث اور تصوف کے میدان

میں گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ لیکن ساتھ ہی شاہ صاحب نے اسلام کے فکری، اخلاقی، شرعی اور تمدنی نظریات و تعلیمات کو ایک مرتب نظام کی صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ شاہ صاحب نے اسلامی تحقیق کا ایک نیا دروازہ کھولا۔ اس سے پہلے جو کچھ لکھا گیا وہ صرف اسلامی فلسفہ کہلایا۔ لیکن شاہ صاحب نے اسلامی فلسفہ کو بحیثیت ایک نظام کے پیش کیا۔ شاہ صاحب نے اپنے عمرانی نظریات کے ذریعے ایک مکمل معاشرے کا تصور پیش کیا۔ شاہ صاحب نے اپنے عمرانی نظریات میں تحقیق کے لئے جو راہ اختیار کی وہ استقرائی اور استخراجی [۴] دونوں مکاتب فکر کے بین بین ہے۔ شاہ صاحب نے دونوں مکاتب فکر کے طریقوں کو یکجا کیا اور اپنے عمرانی نظریات کو استوار کیا۔ اجتماعی فکر میں شاہ صاحب کا بہت بلند مرتبہ ہے اور ان کے افکار مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن سردست ہم شاہ صاحب کے عمرانی نظریات کے وسیع خزانے میں سے صرف انہی پہلوؤں پر بحث کریں گے جن کا تعلق موجودہ دَور کے مسائل اور ان کے حل سے ہے۔

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے عمرانی نظریات ہمارے لئے اس لئے بھی سود مند ہیں کہ اُس دَور کی طرح آج کے دَور کے مسلمانوں نے بھی جس طرز زندگی کو اختیار کر رکھا ہے اس کی اسلامی عقائد سے قطعاً کوئی مطابقت نہیں۔ شاہ صاحب نے اپنے نظریات کو پیش کرنے سے پہلے یہ قدم اٹھایا کہ مسلمانوں کے ماضی اور حال کا تفصیلی جائزہ لے کر جامعیت کے ساتھ ان پر تنقید کی اور پھر مسلمانوں کے عملی و ذہنی ورثہ کو دوسرے عقائد و علوم کی ملاوٹ سے پاک کیا۔ شاہ صاحب نے تعمیرِ نو کا ایک واضح اور قابل عمل نقشہ پیش کیا اور یہ تعمیری کام شاہ صاحب نے بہت خوبی سے سرانجام دیا۔ شاہ صاحب نے اپنے عمرانی نظریات میں انسانی معاشرے کی ابتداء سے لے کر مکمل معاشرے تک کے مختلف مراحل کے بارے میں بحث کی ہے۔ شاہ صاحب کامل معاشرے کو ملت قصویٰ کا نام دیتے ہیں۔ شاہ صاحب کامل معاشرے کے جو مقاصد بیان کرتے ہیں اُن کے سوتے خود خرد اور اس کے ماحول سے پھوٹتے ہیں۔ شاہ صاحب کامل معاشرے میں اجتماعی زندگی سے متعلق جو اصول وضع کرنے کو کہتے ہیں ان کا تعلق عام انسانی زندگی سے ہے۔ چونکہ شاہ صاحب کو خود بھی خدشہ تھا کہ کامل معاشرہ یا ملت قصویٰ کا وجود میں آنا ممکن نہیں ہے اس لئے اس خدشہ کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ ملتِ قصویٰ کا پورے طور پر حصول ناممکن

ہے، لیکن ملت قصوی کے تصور کی روشنی میں اس منزل کے قریب جانے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔

شاہ صاحب کے مطابق معاشرے کے ارتقاء کا یہ سلسلہ معمول کے حالات میں برابر جاری رہتا ہے۔ لیکن بعض اوقات ایسے غیر معمولی حالات پیدا ہو جاتے ہیں جو کہ معاشرے کی نشوونما کے لئے سخت مضر ہوتے ہیں۔ اس صورت حال کی وجہ سے معاشرہ بہت سی مہلک برائیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے اور یہ خرابیاں زندگی کے شعبوں میں فساد کا باعث بنتی ہیں، جیسے کہ آج پورا پاکستان سماجی، فکری، معاشی، اخلاقی، شرعی اور تمدنی برائیوں میں مبتلا ہے۔ شاہ صاحب ان معاشرتی بیماریوں کی تشخیص اور پھر ان کے علاج پر بہت زور دیتے ہیں۔ شاہ صاحب فاسد رسوم و رواج، معاشی عدم توازن اور جرائم کی کثرت کو معاشرے کی خرابی کا باعث سمجھتے ہیں۔ آپ ان برائیوں کے مہلک اثرات پر سیر حاصل بحث کرتے ہیں اور پھر ان کو جڑ سے ختم کرنے کے لئے طریقے بھی بتاتے ہیں۔

رسوم و رواج سے یہ مراد ہے کہ معاشرے میں زندگی گزارنے کی جو عملی صورت ہے وہ رسم کہلاتی ہے اور فاسد رسوم و رواج وہ ہیں جو معاشرے پر محض بار بن جاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ :

> "اے بنی آدم! تم نے ایسی فاسد رسمیں اختیار کرلی ہیں جن سے دین متغیر ہو گیا ہے..... پھر تم نے ایسی رسمیں بنا رکھی ہیں جن سے تمہاری زندگی تنگ ہو رہی ہے۔ مثلاً شادیوں میں فضول خرچی، طلاق کو ممنوع بنالینا، بیوہ عورتوں کو بٹھائے رکھنا۔ تم اپنے مال اور زندگیوں کو خراب کر رہے ہو اور ہدایات صالحہ کو تم نے چھوڑ دیا ہے"(۳)

ان فاسد رسومات کے سدباب کے لئے شاہ صاحب کہتے ہیں کہ افراد معاشرہ کو چاہئے کہ عام انسانیت اور حکمت کلی پر زور دیں اور اس ناجائز، فاسد اور غلط فعل سے دور رہیں جو انسانیت کی فلاح اور معاشرے کی بہبود کے خلاف ہو۔ اسی طرح معاشی عدم توازن، جو معاشرے کے لئے سب سے بڑا روگ ہے، سے یہ مراد ہے کہ انسانوں کا ایک مخصوص طبقہ ضرورت سے زائد مال و دولت کا مالک بن جائے اور اس کے مقابلے میں انسانوں کی بڑی تعداد فاقے پر مجبور ہو جائے۔ یہ صورت حال فشارِ امن کا باعث بنتی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ:

"معاشی عدم توازن بداخلاقی کے مرض میں مبتلا کر دیتا ہے اور آخرت یعنی یاد الٰہی اور روحانی زندگی سے یکسر غافل کر دیتا ہے"(۴)

آپ نے مزید فرمایا کہ :

"انسانیت کے اجتماعی اخلاق اس وقت بالکل برباد ہو جاتے ہیں جب کسی جبر سے ان کو اقتصادی تنگی پر مجبور کیا جائے اور وہ گدھے اور بیل کی طرح صرف روٹی کے لئے کام کریں"(۵)

شاہ صاحب نے ایک دوسری جگہ فرمایا کہ :

آجکل جو شہر برباد ہو رہے ہیں اس کے دو بڑے سبب ہیں' ناحق مال بٹورنا۔ مثلاً لوگ سرکاری بیت المال کے گرد جمع ہو جاتے ہیں اور مختلف حیلے بہانوں سے روپے اینٹھتے ہیں۔ اور گراں بار ٹیکس شہر کے برباد ہونے کا دوسرا سبب ہوتا ہے۔ حکام کاشت کاروں' تاجروں اور پیشہ وروں پر بھاری ٹیکس لگاتے ہیں اور اس کی وصولی کے لئے انہیں تنگ کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ جو لوگ بخوشی ٹیکس ادا کرتے ہیں ان کا استحصال کر ڈالتے ہیں اور جو لوگ سخت ہوتے ہیں وہ ٹیکس ادا کرنے سے بغاوت اختیار کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ شہر قلیل ٹیکس اور ضرورت کے مطابق محافظین کار مقرر کرنے سے ہی اچھا رہ سکتا ہے۔ ہمارے معاشرے کے لوگ اس نکتہ سے تنبیہہ حاصل کریں"(۶)

آپ نے فضول خرچی' بے جا نمود و نمائش اور زر پرستی کے غلبہ سے بچاؤ کی تعلیم دی۔ شاہ صاحب معاشرے کی اقتصادی خوشحالی کو اہم ترین جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ :

"رعایا اور راعی دونوں فضول خرچیوں اور جھوٹی نمود و نمائش سے پرہیز کریں"۔

شاہ صاحب نے فرمایا کہ ان حالات سے پریشان ہو کر ایک گروہ اٹھتا ہے جو یہ چاہتا ہے کہ معاشرے میں معاشی توازن کی عملداری رائج ہو جائے۔

معاشرے کی تیسری اہم برائی کثرتِ جرائم ہے اور عمرانیات کی رُو سے جرائم سے مراد وہ فعل ہے جو کہ قانون کی رو سے غلط ہو۔ قانون بنانا حکومت کا فرض ہے اور جرائم کی روک تھام بھی حکومت کی ذمہ داری ہے۔ شاہ صاحب کے مطابق جرائم بھی معاشرے اور اجتماعی زندگی پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ ان کی روک تھام کرنے کے لئے

حکومت کو مجرموں کی انفرادی طور پر نگرانی کرنی چاہئے۔ امن کا قیام حکومت کی ذمہ داری ہے۔ شاہ صاحب نے جرائم کی سات اقسام بیان کی ہیں۔ شاہ صاحب کے مطابق جرائم کے اسباب و علل کی تحقیقات ضرور کرنی چاہئے تاکہ ان کا سدباب کیا جائے۔ اس کے علاوہ جرائم پیشہ کو مفسد حرکات سے روکنے کے لئے سزائیں دینا بھی ضروری ہے۔ شاہ صاحب نے متعدد جگہ پر زور دیا ہے کہ سزائیں دینے کا عمل ایسا نہ ہو جس سے ظاہر ہو کہ مجرموں سے انتقام لیا جا رہا ہے بلکہ ایسی سزائیں رواج پائیں جن سے مجرموں کی اصلاح ہو۔ آج ہم شاہ صاحب کے نظریات کو سامنے رکھ کر اصلاح معاشرہ کر سکتے ہیں۔ اس لئے کہ شاہ صاحب کی تعلیمات میں شریعت کے قوانین اور اس کی روح دونوں کی نہایت عمدہ عکاسی موجود ہے۔

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے نہ صرف اپنے عہد کیلئے ایک مکمل لائحہ عمل پیش کیا بلکہ آپ کی تحریریں آج کے پاکستان کیلئے بھی باعث صد رحمت ہیں۔ بقول مولانا عبید اللہ سندھی :

"شاہ صاحب کی اس حکمت کا سلسلہ کہیں نہیں ٹوٹتا۔ ان کا نظام جامع' عالم گیر اور ہمہ گیر ہے"(۷)

حواشی

(۱) ۲۷/ دسمبر ۱۷۳۸ء کو ایران کا بادشاہ نادر شاہ اٹک کے مقام پر دریائے سندھ کو عبور کر کے حملہ آور ہوا اور ۲۴/ فروری ۱۷۳۹ء کو دہلی کے قریب کرنال کے مقام پر اس نے مغل بادشاہ محمد شاہ رنگیلا کو شکست دی تھی۔

(۲) شاہ صاحب دلائل دینے کے لئے استقرائی اور استخراجی دونوں مکاتب فکر کے طریقۂ کار کو اختیار کرتے رہے۔ آپ کے یہاں مشائی اور اشراقی مکاتب فکر کا بہترین سنگم پایا جاتا ہے۔ آپ خود فرماتے ہیں کہ : "کامل وہ ہے جو جزو سے کل اور کل سے جزو پر آئے اور دونوں کے تضاد کو دور کرے"۔ آپ نے فرمایا کہ "اہل دین کا یہ حال ہے کہ وہ کلی تصورات پر اکتفا کئے بیٹھے ہیں اور دوسری طرف اربابِ عقل کا گروہ ہے جو جزئیات میں اُلجھ کر رہ گیا ہے۔ دونوں غلطی پر ہیں۔ دونوں کی حقیقت تک رسائی نہیں"۔ (از پروفیسر رشید احمد' مسلمانوں کے سیاسی افکار)

(۳) مولانا مودودیؒ "تجدید و احیائے دین" ص ۱۰۱

(۴) شمس الرحمٰن محسنی "شاہ ولی اللہ کے عمرانی نظریئے" ص ۱۲۹

(۵) شمس الرحمٰن محسنی "شاہ ولی اللہ کے عمرانی نظریئے" ص ۱۳۰

(۶) شمس الرحمٰن محسنی "شاہ ولی اللہ کے عمرانی نظریئے" ص ۱۳۵-۱۳۴

(۷) شمس الرحمٰن محسنی "شاہ ولی اللہ کے عمرانی نظریئے" ص ۱۴۱

ماہ رمضان المبارک کے دوران مرکزی انجمن کے زیر اہتمام

نونہالانِ وطن کیلئے رجوع الی القرآن کی خصوصی مہم

مرتب : غازی محمد وقاص

ماہِ رمضان المبارک برکتوں اور رحمتوں کے ساتھ نزول قرآن کا بھی مہینہ ہے۔ اس ماہ مبارک میں خواص اور عوام الناس کے رجوع کی غرض سے مرکزی انجمن خدام القرآن گذشتہ تیس برس سے رجوع الی القرآن کی مہم مختلف انداز سے چلاتی رہتی ہے۔

رجوع الی القرآن کی دعوت کو نونہالانِ وطن تک پہنچانے میں سب سے زیادہ دلچسپی ڈاکٹر نسیم الدین خواجہ لیتے ہیں۔ وہ مرکزی انجمن کی مشاورت اور مجلس عاملہ میں قبل از وقت یاددہانی کرواتے ہیں اور اس کے لئے تجاویز بھی دیتے ہیں۔ اس سال ان کی تجویز پر صدر مؤسس ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے فیصلہ کیا کہ سکولوں کے ہائی کلاسوں کے طلبہ سے خطاب کیا جائے اور وہاں ''قرآن حکیم اور ہماری ذمہ داریاں' عظمت قرآن اور عظمت صیام و قیام رمضان'' پر مشتمل لٹریچر مفت تقسیم کیا جائے۔ چنانچہ اس مہم کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی ذمہ داری ڈاکٹر نسیم الدین خواجہ صاحب نے خود اٹھائی اور ان کی معاونت عبدالرزاق صاحب ناظم حلقہ لاہور ڈویژن نے کی۔

ڈاکٹر نسیم الدین خواجہ صاحب نے پہلا رابطہ گورنمنٹ سلیمانیہ پبلک ہائی سکول سمن آباد کے ہیڈ ماسٹر جناب میاں نذیر طاہر صاحب سے کیا۔ انہوں نے نہایت گرمجوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہ صرف اپنے سکول میں پروگرام منعقد کروایا بلکہ سمن آباد کے دیگر سکولوں میں بھی پروگرام منعقد کروانے میں بھرپور تعاون کیا۔ ماہِ رمضان المبارک کے پہلے عشرہ میں ماہ دسمبر کی چھٹیوں کی وجہ سے پروگرام کا آغاز نہ ہو سکا' جبکہ دوسرے عشرے کے وسط میں شدید سردی اور دھند کی وجہ سے سکولوں میں صبح کے وقت اسمبلیاں نہیں ہو رہی تھیں۔ جس کی وجہ سے محسوس ہو رہا تھا کہ یہ پروگرام منعقد ہونا ممکن نہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل و کرم اس ماہ مبارک پر ہے کہ اس ماہ کے دوران شیاطین و جن قید کر لیے جاتے ہیں۔ چنانچہ ان پروگراموں کے انعقاد میں حائل رکاوٹیں بحمد اللہ دور ہو گئیں اور پروگرام ہوئے' جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

① گورنمنٹ سلیمانیہ پبلک ہائی سکول' سمن آباد

۱۶/ رمضان المبارک ۱۴۱۹ھ بروز منگل گیارہ بجے دوپہر ساتویں تا دسویں جماعت کے تقریباً تین

سو طلبہ کو گراونڈ میں جمع کیا گیا اور سکول کے تمام اساتذہ بھی جمع ہو گئے۔ ہیڈ ماسٹر میاں نذیر طاہر صاحب نے مختصر تعارف کروایا اور اس کے بعد راقم نے روزہ کی غرض و غایت بیان کی کہ اس کا مقصد حصولِ تقویٰ ہے۔ یہ ایک ماہ کا ٹریننگ پروگرام اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس لئے دیا ہے کہ ہمارے اندر ایک ماہ کے مقررہ وقت میں اس کی حلال کی ہوئی چیزوں سے رکنے کی عادت پیدا ہو جائے اور اگلے گیارہ ماہ میں ہم اس کی حرام کی ہوئی چیزوں سے رک جائیں۔ اور اس روزہ کا دوسرا پروگرام رات کا قیام ہے' جس میں ہمیں قرآن مجید کے ذریعے یہ بھی معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ کے اور مزید کیا احکام ہیں جو ہم عموماً بھولے ہوئے ہیں۔ اس کی یاددھانی ہو جائے اور ان احکام پر بھی عمل پیرا ہوں اور جو غلط کام اور گناہ سرزد ہو رہے ہیں' ان سے بھی رک جائیں۔ اس متوازی پروگرام پر انسان پورے ماہ عمل پیرا رہے تو اس کے اندر تقویٰ پیدا ہو جاتا ہے جو کہ نجات اُخروی کا باعث بنے گا۔

اس کے بعد پروفیسر فیاض حکیم نے خطاب کیا۔ ان کا موضوع "قرآن مجید کے حقوق" تھا۔ انہوں نے طلبہ کی توجہ قرآن مجید کی زبان "عربی" سیکھنے پر کرائی اور اس کے پانچ حقوق جو عموماً صدر مؤسس کی کتاب "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" کے حوالے سے بیان کئے جاتے ہیں' نہایت اختصار اور آسان زبان میں بیان کیے۔ یہاں چھ سو (۶۰۰) کتابچے تقسیم کیے گئے۔

② گورنمنٹ اسلامیہ ہائی سکول سمن آباد

بروز بدھ ۱۷ دسمبر ۹۸ء صبح آٹھ بجے "سکول اسمبلی" سے راقم نے "روزہ اور قرآن مجید" کے موضوع پر خطاب کیا۔ پروگرام میں شرکت کرنے والے طلبہ کی تعداد ۱۵۰ تھی جبکہ دس اساتذہ بھی موجود تھے۔

③ سیکرڈ ہارٹ سکول۔ ریگل چوک لاہور

یہ پروگرام ۱۷ دسمبر ۹۸ء صبح دس بجے سکول کے گراونڈ میں منعقد ہوا' جس میں ساتویں تا دسویں جماعت کے ۲۰۰ طلبہ نے شرکت کی۔ راقم اور محمد مبشر صاحب نے "قرآن اور روزہ" کے حوالہ سے گفتگو کی۔ یہاں دو سو کتابچے تقسیم کئے گئے۔

④ سنٹرل ماڈل سکول نمبر ۲ سمن آباد

یہ پروگرام اساتذہ کے ساتھ افطاری کا تھا' جو سکول ہی میں بروز بدھ ۱۷ دسمبر ۹۸ء منعقد ہوا' جس سے پروفیسر فیاض حکیم صاحب نے خطاب کیا۔

⑤ سنٹرل ماڈل سکول نمبر۲ سمن آباد

یہ پروگرام جمعرات ۷ جنوری ۹۹ء سکول ہذا کی دوسری شفٹ کے طلبہ سے ساڑھے بارہ بجے دوپہر ہوا' جس سے پروفیسر فیاض حکیم صاحب نے روزہ اور قرآن مجید کے موضوع سے خطاب فرمایا۔ اس پروگرام میں دو سو طلبہ اور سات اساتذہ شریک ہوئے۔

⑥ سنٹرل ماڈل سکول نمبر۲ سمن آباد

یہ پروگرام ۸ جنوری ۹۹ء بروز جمعہ صبح آٹھ بجے "سکول اسمبلی" میں ہوا اور پروفیسر فیاض حکیم صاحب نے "قرآن حکیم اور ہماری ذمہ داریاں" کے موضوع پر خطاب کیا۔ یہاں طلبہ کی تعداد دو ہزار اور اساتذہ کی تعداد ۲۵ تھی۔ یہاں بھی لٹریچر تقسیم ہوا۔

ان تمام پروگراموں میں ہیڈ ماسٹر صاحبان کا حد درجہ کا تعاون رہا۔ انہوں نے اس پروگرام اور محنت کو خوب سراہا جو کہ صرف اور صرف توفیق رب العالمین سے ہو سکا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں مزید ہمت اور توفیق عطا فرمائے۔

بقیہ : کتابتِ مصاحف اور علمِ ضبط

کے بیان کے لئے دیکھئے مندرجہ ذیل مصاحف کے ضمیمہ ہائے "التعریف"۔ مصحف المدینہ ص "د" مصحف الجماھیریہ ص "ل"

۱۰۴۔ حق التلاوۃ ص ۶۹' الکلاک ص ۷۰

۱۰۵۔ مثلاً مصری اور سعودی مصحف جہاں زائد کی علامت "x" کی بجائے " " ڈالی گئی ہے۔

۱۰۶۔ مثلاً دیکھئے ترکی مصحف بقلم حامد ایتاج شروع سورۃ البقرۃ ہی میں "اولئک"۔

۱۰۷۔ مثلاً دیکھئے ایرانی مصحف بقلم طاہر تبریزی شروع سورۃ البقرہ ھی میں "اولئک"۔

۱۰۸۔ مثلاً مصری مصحف الحلبی' ایرانی مصحف بخط سید حسین میرخانی اور ترکی مصحف بخط حافظ عثمان۔

۱۰۹۔ مصحف الحلبی ص ۵۲۳' ص ۵۲۵' بیان علامات (التعریف)

۱۱۰۔ بعض ترکی اور ایرانی مصاحف کا ذکر اوپر حاشیہ نمبر ۱۰۶ تا ۱۰۸ میں آیا ہے۔ چینی مطبوعہ نمونے ہمارے سامنے صرف "ختم القرآن" اور "الخطب الاربعون" کے ہی تھے۔

سانحۂ کربلا

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی عزیمت و عظمت کی صحیح تصویر

شہیدِ مظلوم

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مناقب اور آپ کی مظلومانہ شہادت کے بیان پر جامع تالیف

- یہود نے عہدِ صدیقی رضؓ میں جس سازش کا بیج بویا تھا، آتش پرستانِ فارس کے جوشِ انتقام نے اسے تناور درخت بنا دیا۔
- وہ آج بھی قاتلِ خلیفۂ ثانی ابولؤلؤ فیروز مجوسی کی قبر کو متبرک سمجھتے ہیں
- علی مرتضیٰ رضؓ کی طرح حضرت حسین رضؓ بھی قاتلینِ عثمان رضؓ کی سازش کا شکار ہوئے
- سید الشہداء کون ہیں اور شہیدِ مظلوم کون؟ تاریخی حقائق کو سمجھنے کے لیے

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد

کی دو جامع اور مختصر مگر عام فہم اور محققانہ تاریخی کتابوں

کا مطالعہ کیجیے

دونوں کتابوں کے سیٹ کی مجموعی قیمت

صرف -/۱۶ روپے

قریبی بک سٹال سے طلب کیجیے یا ہم سے منگوائیے

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

فون: ۵۸۶۹۵۰۱

سے بھی زیادہ ہے۔ ان کا معاملہ یہ ہے کہ اس عمر میں ان کی اہلیہ داغ مفارقت دے گئیں۔ بچے پہلے export ہو چکے تھے' ایک بیٹا سعودی عرب میں ہے' دو بیٹیاں ہیں جن میں سے ایک کینیڈا میں اور ایک امریکہ میں ہے اگرچہ ملک بشیر صاحب خود بھی یہاں سے منتقل ہو گئے ہیں ان کا ہم پر حق ہے کہ ہم ان کو اپنی دعا میں شامل کریں۔ ہمارے ایک اور ساتھی میاں محمد رشید صاحب جو ہمارے شروع کے آٹھ مؤسسین میں سے ہیں وہ بھی اب امریکہ منتقل ہو چکے ہیں۔ اسی طرح حاجی محمد اقبال صاحب جنہوں نے ہماری مسجد کی تعمیر کروائی ہے اور سید منظور حسن صاحب جنہوں نے ہمیں سمن آباد میں پلاٹ دیا ہے ان سب کے لئے دعا کیجئے ـــــ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلَھُمْ وَارْحَمْھُمْ وَاَدْخِلْھُمْ فِیْ رَحْمَتِكَ وَحَاسِبْھُمْ حِسَابًا یَّسِیْرًا۔ اَللّٰھُمَّ اشْفِھِمْ وَارْحَمْھُمْ اے اللہ ان میں سے جو بیمار ہیں ان کو شفاء عطا فرما اور جو فوت ہو چکے ہیں ان کی مغفرت فرما اور انہیں اپنے دامن رحمت میں جگہ عطا فرما۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَجْمَعِیْنَ۔ بِرَحْمَتِكَ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ ○○

وقت کے نہایت اہم' انتہائی نازک اور حساس موضوع پر

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کی وقیع تالیف

شیعہ سُنّی مفاہمت

کی ضرورت و اہمیت

ملنے کا پتہ :

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

36۔ کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور فون : 3-5869501

قرآن فہمی بذریعہ کمپیوٹر

امیر تنظیم اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد

کی آواز میں

ترجمۂ قرآن اور دروسِ قرآن پر مشتمل دو کمپیوٹر CD

ترجمہ قرآن CD

قرآن مجید کا مکمل ترجمہ اور مختصر تشریح مع متن قرآن

دورانیہ : 108 گھنٹے خصوصی رعایتی قیمت : 125 روپے

الھدیٰ CD

مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کے 44 دروس پر مشتمل کمپیوٹر CD

جس میں اضافی طور پر محترم ڈاکٹر صاحب کے تقریباً 40 خطباتِ جمعہ اور تقاریر بھی شامل ہیں

دورانیہ : تقریباً 100 گھنٹے خصوصی رعایتی قیمت : 125 روپے

پیشکش :

شعبہ سمع و بصر مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

قرآن اکیڈمی '36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور

فون : 3_5869501 فیکس : 5834000

Email : aasif@brain.net.pk.

www.tanzeem.org.pk.